مونوگراف

عبدالقوی دسنوی

دیوان حسّان خاں

مونوگراف

عبدالقوی دسنوی

دیوان حنّان خاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی-110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2017
تعداد : 550
قیمت : -/70 روپئے
سلسلۂ مطبوعات : 1955

Abdul Qavi Desnavi

By: Diwan Hannan Khan

ISBN :978-81-934243-0-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر:49539000، فیکس:49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر:26109746
فیکس:26108159 ای میل:ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل:urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسارامیجنگ سسٹمس، ڈی 31، ایس ایم اے انڈسٹریل ایریا، نزد جہانگیر پوری میٹرو اسٹیشن، دہلی۔110033
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

ہمارا دور بھی عجیب ہے ایک طرف جہاں اردو زبان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب دوریاں نزدیکیوں میں تبدیل ہوتی جا رہی ہیں۔ جدید تکنیکی انقلاب نے معلومات کے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کر ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے ایسے میں اس خوف کا دامنگیر ہونا خلاف واقعہ نہیں کہ ہمارا قدیم و کلاسیکی ادب اس تکنیکی طلاطم کا شکار نہ ہو جائے۔

اپنے نابغہ ادیبوں و شاعروں پر مونوگراف لکھوانے کے اس نئے سلسلے کا آغاز اسی لیے کیا گیا ہے تا کہ ہم نئی نسل کے سامنے کم سے کم صفحات میں معروف ادبا کا سوانحی خاکہ بھی پیش کر سکیں اور ان کی تحریروں کے منتخب نمونے بھی۔

قومی کونسل نے اس سلسلے میں موجودہ اہم اردو قلمکاروں کی خدمات حاصل کی ہیں اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم قارئین کو براہ راست اپنے اس تجربے میں شامل کریں۔ ہماری یہ کوشش ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اہم ادیبوں پر مونوگراف شائع کر دیں اور یہ بھی کوشش ہے کہ یہ مونوگراف معلومات کا ذخیرہ بھی ہو، اب اس معیار کو ہم کس حد تک حاصل کر سکے اس کا فیصلہ آپ کریں گے لیکن آپ سے یہ گزارش ضرور ہے کہ اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں ضرور نوازیں تا کہ ہم آئندہ ان مشوروں کو نشانِ منزل بنا سکیں۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈائرکٹر

فہرست

	حرفِ آغاز	vii
1۔	شخصیت اور سوانح	1
2۔	ادبی و تخلیقی سفر اور تصانیف کا جائزہ	17
3۔	تنقیدی محاکمہ	23
4۔	مصنف کی تحریروں کا جامع انتخاب	55

حرفِ آغاز

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی طویل اور اہم علمی، ادبی اور تدریسی خدمات محتاجِ تعارف نہیں ہیں۔ ان کا شمار ایک اچھے انسان، کامیاب استاد، نامور محقق، ناقد، اشاریہ ساز، ادیب اور اردو کے عاشقوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے غالبیات، اقبالیات، بھوپالیات، اشاریہ سازی اور ابوالکلام آزاد سے متعلق کئی وقیع تحقیقی اور تنقیدی مقالات قلم بند کیے ہیں اور تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا تعلق بہار میں واقع مردم خیز قصبہ دیسنہ کے ایک معروف علمی، ادبی خانوادے سے تھا۔ گھر کے مخصوص علمی، ادبی اور تہذیبی ماحول میں ان کی تربیت ہوئی اور ان کی علمی و ادبی نیز تصنیفی کاوشوں کا سلسلہ زمانہ طالب علمی میں ہی شروع ہوگیا تھا جو کہ آخری عمر تک جاری رہا۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک علمی، ادبی، تصنیفی اور تدریسی کاموں میں مصروف رہ کر انھوں نے اردو زبان کی ترقی اور ترویج و اشاعت میں سرگرم حصہ لیا اور مختلف موضوعات پر پچاس سے زیادہ کتب اور تین سو سے زیادہ مقالات و مضامین قلم بند کیے۔ بحیثیت غالب شناس، اشاریہ ساز، ماہر اقبال و آزاد ادبی دنیا میں انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی تحریریں اور تصانیف نہ صرف استناد کا درجہ رکھتی ہیں بلکہ ریسرچ اسکالرس کے لیے رہنمائی کا کام بھی انجام دیتی ہیں۔

پروفیسر دسنوی کی ہمہ جہت و ہمہ گیر علمی و ادبی خدمات کا اعتراف انھیں اعزاز دے کر ان کی زندگی میں بھی کیا گیا اور ان کی وفات کے بعد ہند و پاک کی مختلف جامعات میں ان پر تحقیقی کاموں کا سلسلہ جاری ہے۔

پروفیسر محمد نعمان خاں اور کوثر صدیقی نے ان کی حیات میں ہی ان پر ایک ضخیم کتاب بعنوان: 'عبدالقوی دسنوی ایک مطالعہ' شائع کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے ایک قومی سمینار یکم اور دو اپریل 2012 کو بھوپال میں منعقد کیا گیا۔ اس دو روزہ سمینار میں پڑھے گئے تیس سے زیادہ مقالات اور کئی منظومات کو 2013 میں 'عبدالقوی دسنوی۔ حیات اور خدمات' کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی شخصیت اور علمی، ادبی خدمات سے متعلق زیرِ نظر مونوگراف (یک موضوعی مقالہ) دراصل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے خصوصی منصوبے کے تحت شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مونوگراف میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی شخصیت اور سوانحی حالات، ان کی تصنیفات اور تالیفات کا تنقیدی جائزہ، ان کی علمی، ادبی، تدریسی خدمات کا محاکمہ اور ان کی تحریروں کا جامع انتخاب شامل ہے۔

امید ہے کہ اس مونوگراف کے مطالعے سے پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات کو سمجھنے اور ان پر مزید کام کرنے میں آسانیاں پیدا ہوں گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کا یہ ایک نہایت مستحسن قدم ہے۔ میں کونسل کے تمام ذمے داران خصوصاً پروفیسر ارتضیٰ کریم اور مونوگراف کمیٹی کے ممبران کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس مونوگراف کی تیاری میں مکرمی پروفیسر عتیق اللہ صاحب اور پروفیسر محمد نعمان خاں نے جو معاونت فرمائی ہے اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔

دیوان حنان خاں

شخصیت اور سوانح

پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے سوانحی حالات

نام	:	سیّد عبدالقوی
قلمی نام	:	عبدالقوی دسنوی
والدین	:	پروفیسر سیّد سعید رضا، حسنی بیگم
تاریخ پیدائش	:	یکم/نومبر 1930 (دسنہ)
تاریخ وفات	:	7/جولائی 2011 (بھوپال)
وطن	:	دسنہ (بہار)
وطن ثانی	:	بھوپال، (مدھیہ پردیش)
ابتدائی تعلیم	:	مدرسۃ الاصلاح، دسنہ، بی این ریلوے اسکول، کھڑک پور، (بنگال)، آرا اسکول، شاہ آباد (بہار)
اعلیٰ تعلیم	:	سینٹ زیویرس کالج، بمبئی (بمبئی یونیورسٹی، بمبئی)
ملازمت	:	

- احمد سیلر ہائی اسکول، بمبئی (1960-1961)
- سیفیہ کالج، بھوپال (1961-1990)

اعزازی عہدے

- چیئرمین، بورڈ آف اسٹڈیز، بھوپال یونیورسٹی، بھوپال (1977-1980)
- ڈین فیکلٹی آف آرٹس، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال (1980-1982)
- ممبر ایکزیکیٹو کونسل، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال (1980-1982)
- ممبر مجلس عام انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی، (1979-1984)
- ممبر ترقی اردو بورڈ، دہلی (1977-1978)
- ممبر پروگرام ایڈوائزری کمیٹی، آل انڈیا ریڈیو، بھوپال، (1980-1982)
- ممبر مجلس عام، دارالعلوم تاج المساجد، بھوپال

- سکریٹری مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال (1992-1991)
- سکریٹری کل ہند، علامہ اقبال ادبی مرکز بھوپال (1992-1991)

انعامات واعزازات

- شبلی انعام-1957 (بمبئی)
- امتیاز میر-میر اکادمی، لکھنؤ (1981)
- سینئر فیلوشپ، وزارت تعلیم وثقافت، حکومت ہند (1983-1979)
- نواب صدیق حسن خاں ایوارڈ برائے تحقیق وتنقید، مدھیہ پردیش اردو اکادمی (1986)
- ایوارڈ برائے مجموعی ادبی خدمات، بہار اردو اکادمی، پٹنہ (1981)
- پرویز شاہدی ایوارڈ برائے مجموعی خدمات، مغربی بنگال اردو اکادمی (1998)

اعزازی عہدے بزمانۂ تعلیم:

- مدیر کاروانِ ادب /شعبۂ اردو سینٹ زیویرس، کالج، بمبئی 1951
- مہتمم مدیر کاروانِ ادب، شعبۂ اردو سینٹ زیویرس کالج، بمبئی 1954
- معاون رکن کاروانِ ادب، شعبۂ اردو سینٹ زیویرس کالج، بمبئی 57-1956
- سکریٹری بزم ادب، سینٹ زیویرس کالج، بمبئی 1956-1955
- میرٹ اسکالرشپ بمبئی یونیورسٹی (دو سال) 1959-1957
- فیلو اُردو فارسی، سینٹ زیویرس کالج بمبئی 1958-1957
- کنوینر انجمن نوجوان مصنفین کانفرنس، بمبئی 1957
- نگراں: ''شاہین'' میگزین احمد سیلر ہائی اسکول، بمبئی 1960
- کنوینر نمائش اخبار ورسائل سہ سالہ جشن شاعر بمبئی فروری، 3، 4، 5، 1960
- مرتب مقالہ نما 'نوائے ادب' سہ ماہی انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی 1960-1959
- ملازمت شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال: 21 فروری 1961 سے یکم نومبر 1990 تک

- لکچرار: 21/فروری 1961 سے 20 فروری 1965 تک

اسسٹنٹ پروفیسر: 21/فروری 1965 سے 30/جون 1968 تک۔

پروفیسر یکم/جولائی 1968 سے یکم نومبر 1990 تک

اعزازی عہدے سیفیہ کالج بھوپال:

- پروپرٹی آفیسر چند سال۔
- اڈیشنل پرنسپل 4/جولائی 1983 سے 16 اگست 1985 تک
- نگراں- 'کاروانِ سیفیہ'، مشاعرہ کمیٹی سیفیہ کالج، بھوپال

اردو ادب کی تاریخ میں بے شمار ادیب، شاعر، ناقد اور محقق پیدا ہوئے لیکن ایسے کم ہی ملیں گے جنھوں نے اپنی ساری زندگی اردو زبان کی خدمت اور اس کے فروغ و بقا کے لیے وقف کر دی ہو۔ ایسے ہی لوگوں میں ایک معتبر نام عبدالقوی دسنوی کا بھی ہے۔ عبدالقوی دسنوی کی پیدائش یکم نومبر 1930 کو بہار شریف سے 8 میل کے فاصلے پر جیرائن ندی کے کنارے واقع قدیم اور مردم خیز گاؤں دسنہ ضلع نالندہ میں ہوئی اور اسی کی نسبت سے انھوں نے ادبی دنیا میں اپنا نام عبدالقوی دسنوی رکھا۔ یہ گاؤں مشاہیر علم وادب کا مرکز رہا۔ دسنوی صاحب کا تعلق بھی ایک علمی و ادبی خانوادے سے تھا۔ معروف عالم دین، محقق، ادیب اور دانشور سیّد سلیمان ندوی ان کے ماموں تھے۔ انھوں نے جس ماحول میں آنکھیں کھولیں وہ خود صاحب کمال شخصیتوں کی آماجگاہ تھا۔ ان کے والد سید سعید رضا انتہائی ذی علم بزرگ تھے اور بمبئی میں سینٹ زیویرس کالج میں اردو، فارسی، عربی کے پروفیسر و صدر شعبہ تھے۔ ان کی والدہ کا نام بی بی حسنیٰ تھا۔ عبدالقوی دسنوی اپنے والدین کی تیسری اولاد تھے۔ ان سے بڑی بہن عفت آرا اور بھائی پروفیسر عبدالحی رضا اور ان سے چھوٹے بھائی عبدالولی و بہن فیضی بانو ہیں۔ عبدالقوی دسنوی کی اہلیہ کا نام نجم النساء ہے۔ وہ ایک پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ وہ بھی ایک علمی، ادبی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ عبدالقوی دسنوی کو بلند مقام عطا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اکثر گھریلو مصروفیات سے فارغ ہوکر وہ ادبی کاموں میں قوی صاحب کی مدد کیا کرتی تھیں۔ ان کی سات اولادیں ہیں۔ جن میں چار بیٹیاں عاتکہ دسنوی، عصمی دسنوی، عالیہ دسنوی انجم دسنوی اور تین بیٹے علی متقی دسنوی، علی نقی دسنوی اور علی نواز دسنوی ہیں جو سبھی لائق اور فائق ہیں۔ قوی صاحب نے اپنے سبھی بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔

قوی صاحب کی ابتدائی تعلیم دسنہ ہی میں مدرستہ الاصلاح میں ہوئی اور گھر کے دینی ماحول میں حاصل ہونے والی تربیت نے اُن کے اخلاق و کردار کو نکھارا۔ ثانوی درجات کی تعلیم انھوں نے بی۔ این ریلوے اسکول مغربی بنگال کے کھڑگپور سے حاصل کی اور ہائی اسکول کا امتحان آرا اسکول شاہ آباد (بہار) سے پاس کیا۔ اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بمبئی چلے آئے اور بمبئی کے سینٹ زیویرس کالج میں داخلہ لیا جہاں ان کے والد پروفیسر سیّد سعید رضا پروفیسر تھے۔

یوں تو عبدالقوی دسنوی سائنس کے طالب علم تھے لیکن اردو سے خصوصی دلچسپی کے سبب 1957 میں اردو اور فارسی اختصاصی مضمون کے ساتھ BA آنرس اوّل درجہ میں پاس کیا اور پھر 1959 میں M A میں فرسٹ کلاس حاصل کیا۔ جلد ہی انھیں بمبئی میں ہی احمد سیلر ہائی اسکول جو شہر کا اچھا اور معیاری اسکول تھا ملازمت مل گئی جہاں انھوں نے 1960 سے 17 فروری 1961 تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ اس دوران انھیں یہ پتا چلا کہ بھوپال سیفیہ کالج میں لیکچرار کی پوسٹ خالی ہے چنانچہ انھوں نے 19 فروری 1961 کو اپنا رختِ سفر باندھا اور بھوپال کے لیے روانہ ہو گئے 21 فروری 1961 کو شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں بحیثیت لکچرار ان کا تقرر ہو گیا۔ جہاں انھوں نے یکم نومبر 1990 تک یعنی تقریباً تیس سال تک درس وتدریس کی خدمات انجام دیں اور اس شعبہ کو سنوارنے کی کوشش میں ہمہ تن مصروف رہے اور ایک تحقیقی کتب خانہ قائم کیا۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی ان کی تصنیف وتالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ انھوں نے بھوپال کو اپنا وطن ثانی بنایا اور آخری دم تک وہیں کے ہو رہے۔ قوی صاحب کا انتقال 7 رجولائی 2011 کو ہوا اور وہ بھوپال میں ہی دفن کیے گئے۔

عبدالقوی دسنوی کی شخصیت کو بنانے میں ان کے گاؤں دسنہ، (جہاں سید سلیمان ندوی (عالم دین) بشیر الحق دسنوی، نجیب اشرف ندوی (مصنف رقعات عالمگیری)، صباح الدین عبدالرحمٰن اور سید شہاب الدین دسنوی جیسی شخصیتوں نے آنکھیں کھولی تھیں) اور مدرستہ الاصلاح کا بڑا ہاتھ ہے۔ جہاں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ علمی خانوادے سے تعلق رکھنے کے سبب صحت مند تہذیبی اقدار، روایات کی پاسداری، اعلیٰ ادبی ماحول، اساتذہ کا احترام، اصلاح معاشرہ کی دھن اور خلوص و دیانتداری انھیں ورثے میں ملی جس نے ان کے ذہن وضمیر کی آبیاری اور شخصیت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان کے والد سیّد سعید رضا بمبئی سینٹ زیویرس کالج میں اردو، فارسی وعربی کے پروفیسر وصدر شعبہ تھے۔ عبدالقوی دسنوی کی پیدائش اور تعلیم کے حصول کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب ہندستان میں آزادی کی جدو جہد جاری تھی، 'ہندستان چھوڑ دتحریک' زوروں پر تھی انقلاب کی آوازیں ہر طرف گونج رہی تھیں ایسے میں اس سے متاثر نہ ہونا ممکن نہ تھا۔ قوی صاحب بھی اس سے متاثر ہوئے اور ان شعرا کی شاعری ان کے لیے

مشعل راہ بنی جنھیں دوسرے لفظوں میں ترقی پسند ادیب وشاعر کہا جاتا ہے۔قوی صاحب نے سیاسی مضامین بھی لکھے اور شاعری بھی کی۔اپنی خودنوشت 'متاع حیات' میں لکھتے ہیں:

''1942 کی ہندوستان چھوڑ تحریک.................کچھ نظمیں کہی تھیں۔''

یہ صحیح ہے کہ انھوں نے بعض موقعوں پر اشعار کہے اور نظمیں بھی لکھیں لیکن اس میدان کو اپنی زندگی کا نصب العین نہیں بنایا۔

قوی صاحب میانہ قد، روشن چہرہ، کشادہ پیشانی، چھریرے ڈیل ڈول، ستھری رنگت، خوش لباس، منکسر المزاج اور خوش گفتار شخص تھے۔چہرے پر ہلکی مسکراہٹ ہر وقت کھلی رہتی تھی، شیروانی اور چوڑے پائچوں کا پائجامہ ان کا خاص لباس تھا۔موقع کی مناسبت سے پینٹ شرٹ اور سفاری سوٹ پہن لیا کرتے تھے۔مزاج میں نفاست کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔کردار اور سیرت وصورت کے اعتبار سے وہ ایک مثالی انسان تھے۔مہمان نوازی ان کی فطرت تھی۔وضع داری، انکساری، عقائد واصول کے تئیں وفاداری، عالمانہ وقار اور زبان سے والہانہ محبت ان کا نصب العین تھا۔سوائے لکھنے پڑھنے اور اردو کی خدمت کے انھیں اور کسی بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ان کی شخصیت کا اندازہ ان کی تحریروں سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔اپنی خودنوشت 'بمبئی سے بھوپال تک' میں لکھتے ہیں:

''میں آدمیت اور احترام آدمی پر شروع سے نہ صرف یقین رکھتا ہوں بلکہ اُسے اپنی زندگی کا اہم حصہ سمجھتا ہوں، میں دوسروں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اور دوسروں کی ترقی پر مسرور ہوتا ہوں۔''

قوی صاحب بزرگوں اور عالموں کا بڑا احترام کرتے تھے اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتے تھے۔قوی صاحب کی عادت واطوار اور شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے آفاق حسین صدیقی لکھتے ہیں:

''قوی صاحب بنیادی طور پر ایک سادہ نیک اور معصوم انسان تھے۔صبر، شکر اور قناعت پسندی ان کی عادت تھی، چالاکی، ہوشیاری، مکاری، ریاکاری، بغض، حسد، منافقت، چاپلوسی اور خوشامد سے وہ دور رہتے تھے۔خوش اخلاقی، منکسر مزاجی، مروت، ہمدردی خودداری، احسان مندی اور مہمان نوازی اُن کی فطرت تھی۔وہ

اپنے محسنوں کو کبھی بھی نہیں بھولتے تھے۔ کسی کی بھی ذرا سی معاونت، مدد یا خوش کلامی کو وہ ہمیشہ یاد رکھتے تھے۔"

(ماخوذ: عبدالقوی دسنوی—حیات و خدمات: مرتبہ محمد نعمان خاں، کوثر صدیقی، آفاق حسین صدیقی)

قوی صاحب کی شخصیت ہمہ گیر تھی ان کی شخصیت کا سب سے اہم پہلو اردو زبان و ادب سے ان کی غیر معمولی محبت و شیفتگی تھی۔ ان کی فعال متحرک زندگی آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ مشعل راہ ثابت ہوگی۔

قوی صاحب بحیثیت طالب علم

اپنے طالب علمی کے دور میں بھی وہ فعال شخصیت کے مالک تھے۔ لہٰذا زمانہ طالب علمی میں بھی وہ مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ یوں تو ادبی ذوق کا سلسلہ صغر سنی ہی سے جاری تھا لیکن تصنیف و تالیف کا باقاعدہ شوق زمانۂ طالب علمی سے شروع ہو گیا تھا۔ 1954 میں جب وہ سینٹ زیویرس کالج میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کی پہلی تصنیف 'ایک اور مشرقی کتب خانہ' 'کتب خانہ الاصلاح کی طلائی جبلی' کے موقع پر منظر عام پر آئی۔ جس میں دسنہ کے اسلاف، مخطوطات اور کتب و رسائل کی تفصیلات نیز الاصلاح کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد بیان کرتے ہوئے انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں اس سے ان کی ذہنی و فکری پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہم جمعیۃ الطلبا دسنہ کی جانب سے اس کتابی پیش کش کو کتب خانہ الاصلاح کی طلائی جوبلی کے موقع پر پیش کر رہے ہیں۔ اس میں دسنہ کے اسلاف اور ان کے اخلاف کی تعلیمی ادبی اصلاحی و علمی رجحانات و حیثیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس نے دسنہ کو ترقی کے منازل پر گامزن کیا۔ دسنہ کی تاریخ بتلاتی ہے کہ جب بھی یہاں کے ارباب علم نے علمی، ادبی، سماجی، اصلاحی و معاشرتی خدمتیں انجام دی ہیں تو اس شاہراہ پر کامیابیوں اور فتح مندیوں نے سنگ میل بن کر ان کا قدم چوما ہے۔ یہ کتاب دراصل ہمارے اسلاف کی دلچسپیوں اور رجحانات کے منتشر و پریشان

اوراق کی شیرازہ بندی ہے، جس میں اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ تاریکی میں پڑے ہوئے واقعات روشنی میں لائے جائیں امید ہے کہ دسنہ کی روایات کے مطابق یہ کتاب دسنہ کے نوجوانوں کے لیے مشعل راہ بنے گی اور ان میں باہمی تعاون اور اتحاد کا جذبہ پیدا کرے گی جو ہمارے اسلاف کا زریں مقصد رہا ہے۔"

1956 میں "حسرت کی سیاسی زندگی چند جھلکیاں" کی اشاعت ہوئی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں علی سردار جعفری نے حسب ذیل حوصلہ افزا رائے کا اظہار کیا تھا:

"حسرت موہانی کی سیاسی زندگی پر نوعمر ادیب عبدالقوی دسنوی کا پیش نظر مقالہ ایک اچھا مطالعہ ہے جو اردو ادب کے باغ میں ایک نئی کلی کھلنے کی بشارت لے کر آیا ہے۔ مقالے کا انداز بہت سلجھا ہوا ہے اور زبان میں بڑی سادگی اور روانی ہے اور یہ اچھے ادب کی پہلی شرط ہے۔ موضوع اور مواد کے اعتبار سے اس مقالے کی اہمیت مسلّم ہے لیکن حسرت کی شاعری کے جس پہلو کو ان کی غزل گوئی کے نام پر عام طور سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسے ابھار کر عبدالقوی صاحب نے اپنے مقالے کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔"

قوی صاحب خود بھی لکھتے تھے اور اپنے ساتھی نوجوانوں کو تصنیف و تالیف پر مائل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے۔ دوران طالب علمی وہ سینٹ زیویرس کالج کی 'بزم ادب اردو' کے فعال رکن اور بزم ادب کے سالانہ مجلہ 'کاروان ادب' کے مدیر اعلیٰ بنائے گئے۔ بمبئی میں وہ ترقی پسند شعرا کے جلسوں اور محفلوں میں کثرت سے شرکت کیا کرتے تھے۔ ان جلسوں میں علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی، بھیم سین، پریتم بیلی وغیرہ اکثر موجود رہا کرتے تھے۔ ان کی تقریروں کو غور سے سنا کرتے اور پھر ترقی پسند تحریک سے لگاؤ کے سبب انھوں نے کیفی اعظمی کی سرپرستی میں 'انجمن نوجوان ترقی پسند مصنفین' میں شمولیت اختیار کر لی۔ اس کے جلسے تقریباً ہر ماہ ہوا کرتے تھے۔ جس میں دسنوی صاحب پیش پیش رہا کرتے تھے۔ انجمن نوجوان ترقی پسند مصنفین نے 1959 میں دسمبر کے اواخر اور 1960 کے اوائل میں ایک شاندار ادبی جشن بھی کیا جس کے کنوینر قوی صاحب تھے۔ اس کے علاوہ میگزین 'شاہین' کے نگراں اور مجلہ 'نوائے ادب

'کے مرتب بھی رہے ۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے قوی صاحب ترقی پسند خیالات کے بھی حامی تھے اور قیام بمبئی کے دوران انھوں نے ترقی پسند تحریک کے فعال کارکن کی حیثیت سے کام بھی کیا تھا جس کی بنا پر ان کے ترقی پسند ادیبوں اور شعرا مثلاً سردار جعفری، کیفی اعظمی، خواجہ احمد عباس، ظ۔ انصاری، پروفیسر احتشام حسین اور مجروح سلطان پوری وغیرہ سے گہرے مراسم قائم ہو گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ترقی پسندی کے سیاسی نظریے سے قطعی متفق نہیں تھے ان کی ترقی پسندی انسان دوستی تھی اور عوامی زندگی کی بھلائی و بہتری کے معاملات تک محدود تھی۔

قوی صاحب بحیثیت استاد:۔

قوی صاحب اپنے شاگردوں کو اپنی ذات کا ایک حصہ سمجھتے تھے۔ ان کی علمی پیاس بجھانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ اپنے شاگردوں کے لیے وہ تاریخ، مذہب، سیاست، معاشیات، لسانیات، ادب، شاعری، تحقیق و تنقید ہر موضوع پر کھل کر بحث کرتے اور ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کرتے اور ان میں تخلیقی و تحریری صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کرتے۔ اس کا بین ثبوت سیفیہ کالج کے دو جریدے سہ ماہی اخبار سائز کا 'نوائے سیفیہ' اور سالانہ 'مجلّہ سیفیہ' جس کے شمارے طلبا کے مضامین سے بھرے رہتے تھے اور ان میں لکھنے کا شوق بڑھتا تھا۔ مجلّہ سیفیہ کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے خاص نمبر دوسرے مقتدر رسالوں کے خاص نمبر جیسے ہوتے تھے جن میں تحقیق و تنقید کا کافی مواد موجود ہوتا تھا۔ ان نمبروں میں 1969 اور 1980 میں شائع ہونے والے غالب نمبر اور یادگار اقبال نمبر خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی اشاعت کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی تھا کہ قوی صاحب اپنے طلبا کو تعلیم کے ساتھ ساتھ تخلیقی فضا فراہم کرنا چاہتے تھے اور ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے تھے جو ان کے لاشعور میں چھپی تھیں اور ابھر آنے کے لیے وقت اور حالات کی منتظر تھیں۔ قوی صاحب نے انھیں وقت، حالات اور مواقع فراہم کیے۔ صرف اتنا ہی نہیں طلبا کی دلچسپی کے لیے وہ ثقافتی اور بحث و مباحثے کی مجلسیں آراستہ کرتے، ادبی مجلسوں کا اہتمام کرتے۔ بی اے (BA) کے طلبا کے لیے انجمن اردو، ایم اے (MA) کے طلبا کے لیے 'اردوئے معلّٰی' سابق طلبا کے لیے' کاروان سیفیہ' اور 'مجلس اردو' کی تشکیل کی جس کے زیر اہتمام طلبا نشستیں منعقد کرتے، اپنی تخلیقات پیش کرتے، اسے پڑھ کر سناتے، ان پر

بحث و اظہار خیال کرتے ۔ملک و بیرون ملک کے دانشوروں، ادیبوں و شاعروں کو مدعو کرتے ۔ اس طرح وہ اپنے شاگردوں میں خود اعتمادی، قابلیت اور حصول علم کا وہ جذبہ پیدا کر دیا کرتے تھے کہ وہ تعلیمی اور تخلیقی میدان میں نمایاں طور پر ترقی کر سکیں۔

اپنے شاگردوں سے وہ اکثر کہا کرتے:

''دیکھو بھئی اس نکتے کو سمجھو، جو دریا میں ڈوبے وہ جان سے جائے۔لیکن جو علم کے دریا میں ڈوبے وہ زندگی پائے، کتاب ہی تو ہے جو قوت متخیلہ کو ایسی موج رواں بنا دیتی ہے جو کبھی مد و جزر سے آشنا کرے تو کبھی کنارہ پر لگا دے''

ڈاکٹر مظفر حنفی اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''استاد محترم عبدالقوی دسنوی کا شمار بھی اساتذہ کی اسی جماعت میں کرتا ہوں جن کا قرب پارس کی طرح لوہے کو سونے میں تبدیل کر دیتا ہے۔اور سونے پر سہاگے کا کام کرتا ہے۔ بڑی عجیب بات ہے کہ ادبی اعتبار سے بھوپال کی سرزمین انتہائی زرخیز ہونے کے باوجود اپنے نونہالان ادب کو تناور درخت کم ہی بننے دیتی ہے لیکن تخلیقی جوہر کی کونپلیں اگر سیفیہ کالج کی کیاریوں میں پھوٹی ہیں تو یہ پودے قبل از وقت کمہلانے سے محفوظ ہو گئے ہیں۔اس دانش گاہ کے شعبۂ اردو کو دسنوی صاحب کی خفگی کا خطرہ مول لے کر اکثر One man show کہا کرتا ہوں یہ انھیں کی ذات واحد کا اعجاز ہے کہ قدم قدم پر مخالفتوں اور رکاوٹوں کے باوجود شعبہ کی لائبریری میں کم یاب و نادر کتب اور نایاب مخطوطات کا ایسا وافر ذخیرہ جمع ہو گیا ہے جس پر مرکزی یونیورسٹیوں کو بھی رشک آتا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس بیش بہا ذخیرے کی ایک ایک کتاب کو حاصل کرنے کے لیے پروفیسر دسنوی کو دشواریوں کے کئی کئی ہفت خواں پار کرنے پڑے ہیں شعبے کے اس بیش بہا علمی و ادبی خزانے سے استفادہ کرنے کا جذبہ طلبا میں بیدار کر دینا دسنوی صاحب کا دوسرا کرشمہ ہے ورنہ ہندوستان میں اچھی لائبریریوں کی کوئی کمی بھی نہیں''

('ارمغان سہابیہ' صفحہ 115-116)

دسنوی صاحب کی ان ہی کوششوں کے سبب بعد میں ان کے کئی طالب علموں نے شاعر، ادیب، صحافی، تنقید نگار کی حیثیت سے اردو کی ادبی دنیا میں اپنا اعلیٰ مقام بنایا۔ ان میں ڈاکٹر مظفر حنفی، ڈاکٹر اخلاق اثر، جاوید اختر، ڈاکٹر حدیقہ بیگم، آفاق حسین صدیقی، ڈاکٹر خالد محمود، اقبال مسعود، ڈاکٹر محمد نعمان خان، یعقوب یاور، ارجمند بانو افشاں، شان فخری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

عبدالقوی صاحب سیفیہ کالج میں شعبۂ اردو کے صرف صدر ہی نہیں بلکہ اس کے روح رواں بھی تھے ان کی انتھک کوششوں نے شعبۂ اردو کو ملک گیر شہرت اور عزت عطا کی اور اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

عبدالقوی صاحب کی محنت، لگن اور عمل کی ایک روشن مثال سیفیہ کالج کی گراں قدر لائبریری ہے۔ جس کا مقابلہ ہندوستان بھر کی بہت ہی بہترین لائبریریاں بھی نہیں کر سکتیں۔ اس لائبریری میں بعض ایسی نادر اور کمیاب کتابوں کا ذخیرہ ہے جو دائمی افادیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے تقریباً دس ہزار کتابیں سیفیہ کالج کی لائبریری میں انتہائی نفاست اور قرینے سے سجائیں تاکہ طلبا کو مطالعہ میں آسانی ہو سکے اور انھیں راہ فرار کا جواز نہ مل سکے۔ اس طرح انھوں نے آئندہ نسلوں کے لیے لازوال علمی و ادبی سرمایہ محفوظ کر دیا اور اپنی محنت اور لگن سے اسے ایک اعلیٰ معیار کی ریسرچ لائبریری بنا دیا۔ جس میں غالب، اقبال، ابوالکلام آزاد، لغات اور بھوپال پر خصوصی گوشے قائم ہیں۔

قوی صاحب کو کتابوں سے غیر معمولی محبت تھی وہ نہ صرف کالج کی لائبریری کے لیے کتابوں کو اکٹھا کرتے تھے بلکہ اپنی آمدنی کا ایک حصّہ کتابوں اور رسائل کی خریداری پر صرف کرتے تھے خود ان کی ذاتی لائبریری نادر کتابوں کا خزانہ ہے۔ پروفیسر آفاق حسین صدیقی لکھتے ہیں:

> ''قوی صاحب کو سیفیہ کالج سے بڑی محبت تھی کیوں کہ ان کے نزدیک یہ ایک ایسا ادارہ تھا جو قوم کے نوجوانوں میں تعلیم کو عام کر کے ان کے بہتر مستقبل کے لیے راہیں ہموار کر رہا تھا۔ سیفیہ کالج کے ساتھ شعبہ اردو کو بھی وہ ایک مثالی شعبہ بنانے کے آرزومند تھے چنانچہ انھوں نے شعبہ کے فروغ اور اس کے وقار کے لیے دن

رات محنت کی۔ شعبہ اردو سے مجلّہ سیفیہ اور نوائے سیفیہ کے علاوہ دوسری کتابیں شائع کر کے شعبہ کو سارے ہندوستان میں متعارف کرایا۔"

پروفیسر حنیف کیفی نے اس ضمن میں دسنوی صاحب کی محنت اور لگن کے تعلق سے لکھا ہے:

"پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب کے علم و عمل کی ایک نہایت روشن مثال سیفیہ کالج کا شعبۂ اردو اور اس کی لائبریری ہے جس کا مقابلہ بہت سی یونیورسیٹیوں کی لائبریریاں بھی نہیں کر سکتیں۔ اس شعبے کا قابل رشک عروج قوی صاحب کی نیک نیتی، دل کی لگن انتھک محنت اور حسنِ انتظام کا رہین منت ہے۔ اس کی مثال اس چھوٹے سے چشمے کی سی ہے جسے اپنا راستہ بنانے کے لیے جانے کتنے سنگ گراں ہٹانا پڑتے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ ایک وسیع دریا کی صورت اختیار کر پاتا ہے جس سے ہزاروں تشنہ لبوں کی پیاس بجھتی ہے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے صرف چند سال کی مدت میں شعبے نے جس برق رفتاری سے ترقی کی اور کالج کے دوسرے شعبوں کے مقابلے میں جو منفرد مقام حاصل کیا وہ نہ صرف قابلِ تعریف ہے بلکہ قابل رشک بھی ہے۔"

معروف شاعر اور ادیب کوثر صدیقی، قوی صاحب کی اردو دوستی اور علمی و ادبی خدمات پر رقمطراز ہیں:

"قوی صاحب نے شعبۂ اردو کے وقار اور معیار کو فروغ دینے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ درس و تدریس کا کام انھوں نے ایک ملازم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حقیقی محبِ اردو کی حیثیت سے کیا۔ شعبہ جاتی لائبریری کے قیام اور توسیع سے انھوں نے طلبا میں تحقیق و تجسس کا شوق پیدا کر کے کاغذ و قلم سے اُن کے رشتے استوار کیے۔ مجلوں کی اشاعت اسی سلسلے کی کڑیاں تھیں جس نے کئی نامور ادیب، شاعر اور افسانہ نگاروں کو جنم دیا۔ مجلوں کی اشاعت کے ساتھ کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا۔

قوی دسنوی کی شخصیت اور مزاج سے متعلق اظہار رائے کرتے ہوئے ان کے شاگرد ڈاکٹر یعقوب یاور لکھتے ہیں:

''قوی صاحب اپنے مزاج کے اعتبار سے بعد از وقت اس جہان آب وگل اور آزمائش گاہ خیر وشر میں آئے۔ ان کے عناصر میں ظہور ترتیب اس وقت ہوا جب ان کے ہم مزاج اور ہم شعار بزرگوں کا بوریا بستر لپٹ رہا تھا۔ جانے والے لوگوں کی جگہ جس طرح اور جس قماش کے آنے والے لوگوں سے پر ہو رہی تھی وہ زمانہ مستقبل کی تمہیدی کھیپ تھی۔ اس کے فوراً بعد ایسے لوگوں کے درود کی رفتار اتنی تیز ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ ظاہر ہے قوی صاحب نے جب اس دنیا میں آنے میں دیر کردی تو اس کا خمیازہ تو انھیں بھگتنا ہی تھا۔ قوی صاحب شریف النفس انسان ہیں۔ قوی صاحب دیانت دار ہیں۔ قوی صاحب دردمند دل کے مالک ہیں۔ ایسے دردمند دل کے جس میں اپنا درد تو کم دوسروں کا درد زیادہ ہے۔ قوی صاحب اپنے کام کو عبادت کا درجہ دیتے رہے ہیں۔ قوی صاحب علم وادب کے سمندر میں اس طرح ڈوبے رہنے والے آدمی ہیں جیسے اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو قیامت آجائے گی۔

وفات:

7/جولائی 2011 کو صبح 5 بجے طویل علالت کے بعد تقریباً 80 سال کی عمر میں بھوپال کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں قوی صاحب نے آخری سانس لی۔

دسنوی صاحب کی شاگردہ ڈاکٹر ارجمند بانو افشاں اپنے مضمون میں لکھتی ہیں:

''استاد محترم کے انتقال والے دن مجھے عصمی دسنوی اور عاتکہ نعمان کے ساتھ لپٹ کر روتا دیکھ امی نے مجھے قوی صاحب کے پاس اس کمرے میں بیٹھادیا جہاں وہ ابدی نیند سو رہے تھے۔ ان کے پوتا پوتی نواسہ نواسی انھیں گھیرے ہوئے تلاوت اور تسبیح خوانی میں مشغول تھے۔ کہنے کے باوجود بھی کوئی ان کے پاس سے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ میں نے دیکھا کہ قوی صاحب کے چہرے پر بڑی آسودہ مسکراہٹ تھی ایک کامیاب انسان کی مسکراہٹ ایک سچے عاشق کی مسکراہٹ جو اپنے مالک حقیقی سے ملنے جا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا قوی صاحب نے ایک بار علامہ اقبال کی آخری بیماری کا

واقعہ سنایا تھا کہ جب ان کے بڑے بھائی ان سے ملنے گئے اور خیریت پوچھی تو علامہ نے کہا تھا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

آخر میں اپنی اس شدید دلی خواہش کا اظہار بھی کرنا چاہتی ہوں کہ استادِ محترم پروفیسر عبدالقوی دسنوی صاحب جیسے مثالی استاد کی مہر تاباں کی طرح روشن فعال شخصیت اور جد و جہد سے بھری کامیاب زندگی اور بیش بہا ادبی کارناموں کو ہماری نصابی کتابوں میں شامل کیا جانا چاہیے تاکہ طلبا اور اساتذہ فیض حاصل کر سکیں۔"

(ماخوذ: عبدالقوی دسنوی حیات اور خدمات، مرتبین محمد نعمان خاں، کوثر صدیقی، آفاق حسین صدیقی، ص: 195 اور 196)

ادبی و تحقیقی سفر اور تصانیف کا جائزہ

قوی صاحب علم و ادب کے تعلق میں وسیع النظر تھے۔ ادب کی ہر صنف سے ان کی دلچسپی یکساں تھی۔ انھوں نے ادب کے ہر میدان میں خواہ وہ تحقیق ہو یا تنقید، مقالہ نگاری ہو یا مضمون نگاری یا انشا پردازی، خاکہ نگاری ہو یا رپورتاژ نگاری، سوانح نگاری ہو یا اشاریہ سازی سبھی میں اپنے جوہر دکھائے۔ لیکن تحقیق سے ان کو خاص لگاؤ تھا۔ دسنوی صاحب نے تقریباً پچاس کتابیں تحریر کیں، تحقیق و تنقید پر انھوں نے 26 کتابیں لکھیں۔ لگ بھگ 15 کتابوں کی ترتیب و تدوین کیں۔ 17 اشاریے اور مختلف موضوعات پر تین سو سے زائد مضامین لکھے۔ کتابوں میں شامل مقالات کی تعداد 55، مختلف ادبی رسائل کے خاص نمبروں میں 71 دیگر رسائل و جرائد میں 283، تبصروں کی تعداد 25 اور اپنے رفیقوں، شاگردوں کی مختلف تصانیف میں شامل پیش لفظ، تعارف یا تاثرات کی تعداد 35 ہے۔ قومی اور بین الاقوامی سطح کے معتبر رسالوں اور خاص نمبروں میں ان کے یہ مضامین اکثر شائع ہوتے رہے۔ ہند و پاک کا شاید ہی کوئی ایسا معتبر رسالہ ہو جس میں اُن کے مضامین نہ شائع ہوئے ہوں۔ جن میں نقوش (لاہور)، ادب لطیف (لاہور)، فن اور شخصیت (بمبئی)، شاعر (بمبئی)، نیا دور (لکھنؤ)، سب رس (حیدرآباد دکن)، ہماری زبان، آج کل 'کتاب نما' (نئی دہلی)، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ذیل میں ان کی تحریر کردہ، مرتب کردہ اور

اشاریہ سازی پر ان کی کتابوں کے نام درج کیے جا رہے ہیں:

تحریر کردہ کتب:۔

(1) ایک اور مشرقی کتب خانہ، جمعیۃ الطلبا، دسنہ 1954

(2) حسرت کی سیاسی زندگی، حلقۂ احباب، دسنہ 1956

(3) علامہ اقبال بھوپال میں، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1967

(4) بھوپال اور غالب، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1969

(5) نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1970

(6) ایک شہر پانچ مشاہیر، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1973

(7) مطالعۂ خطوط غالب، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1975

(8) [illegible]ت تحریریں، اردو پبلیشرز، لکھنؤ 1975

(9) تلاش و تاثر، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1976

(10) مہدی حسن افادی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1977

(11) اقبال انیسویں صدی میں، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1977

(12) اقبال اور دتی، نئی آواز، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1978

(13) مطالعۂ خطوطِ غالب مع اضافہ، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1979

(14) مطالعۂ غبارِ خاطر، نئی آواز، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1981

(15) اقبال اور دار الاقبال بھوپال، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1983

(16) اقبالیات کی تلاش، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1984، اقبالیات کی تلاش، گلوب پبلیشرز، لاہور 1985

(17) ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی 1987

(18) مولانا ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1988

(19) تلاشِ آزاد، مہاراشٹر اردو اکادمی، ممبئی 1990

(20) اردو شاعری کی گیارہ آوازیں، نئی آواز، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1993
(21) معاصرین و متعلقات آزاد، نئی آواز، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1996
(22) متاعِ حیات 1980
(23) اجنبی شہر 1990
(24) حیاتِ ابوالکلام آزاد، موڈرن پبلیشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2000
(25) بمبئی سے بھوپال تک 2004
(26) میں اُردو ہوں، 2006۔

مرتّب کردہ کتب:۔

(1) مجلّہ سیفیہ (کئی شمارے)، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال
(2) نوائے سیفیہ (کئی شمارے) شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال
(3) اور ہندوستان جاگ اٹھا، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1963
(4) مضامین لسان الصدق، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1976
(5) قادر نامہ غالب، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1971
(6) نذرِ سجاد شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1974
(7) مرزا سلامت علی دبیر (خصوصی شمارہ)، ماہنامہ کتاب نما، نئی دہلی 1977
(8) بچوں کے اقبال، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1987
(9) مکاتیب عبدالحق بنام محوی صدیقی انجمن ترقی اردو، پاکستان 1980
(10) نذرِ تخلص، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1981
(11) ارمغانِ سیفیہ، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1986
(12) ماہنامہ لسان الصدق (کلکتہ) مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1988
(13) ہفتہ وار پیغام (کلکتہ) (تقدیم ثانی عبدالقوی دسنوی)، خدا بخش لائبریری، پٹنہ 1989
(14) جواہرِ آزاد، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1990

(15) فخر نامہ،شعبۂ اردو،سیفیہ کالج،بھوپال 1997
(16) دور دیس سے (شعری مجموعہ عطاءالرحمن جمیل، بنگلہ دیش 2005۔

اشاریے:۔

(1) غالبیات،نسیم بک ڈپو،لکھنؤ 1969
(2) انیس نما،شعبۂ اردو،سیفیہ کالج،بھوپال 1973
(3) ہندوستان میں اقبالیات،اقبال اکادمی پاکستان،لاہور 1976
(4) دھنپت رائے نواب رائے پریم چند، کتاب نما جامعہ نگر،نئی دہلی 1981، دھنپت رائے نواب رائے پریم چند، نگار کراچی نے پوری کتاب شائع کردی، اگست 1985
(5) یادگار سلیمان، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1984
(6) یادگار آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1988
(7) مہدی افادی
(8) احتشام حسین
(9) خلیل الرحمن اعظمی۔

قوی صاحب کو ان کی حسب ذیل مطبوعات پر ہندوستان بھر سے مختلف اردو اکادمیوں نے انعامات سے نوازا۔

(1) سات تحریریں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1975
(2) اقبال انیسویں صدی میں، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1977
(3) مطالعہ خطوط غالب، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1979
(4) مطالعہ غبار خاطر، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1981
(5) اقبالیات کی تلاش، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1984
(6) یادگار سلیمان، مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ 1984
(7) ابوالکلام آزاد، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1987

(8) تلاش آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1991

(9) تلاش آزاد، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1991

(10) تلاش آزاد، مغربی بنگال اردو اکادمی، کلکتہ 1991

(11) اُردو شاعری کی گیارہ آوازیں، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1993

(12) اردو شاعری کی گیارہ آوازیں، بہار اردو اکادمی، پٹنہ 1993

(13) معاصرین ومتعلقات آزاد، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ 1996۔

حکومت ہند کی وزارت تعلیمات وثقافت نے انھیں مولانا ابوالکلام آزاد پر تحقیقی کام کرنے کے لیے چار سال تک سینئر فیلوشپ تفویض کی۔

یہ تفصیلات قوی صاحب کے گہرے مطالعے، باریک بینی، سنجیدہ تنقیدی شعور، تحقیقی لگن، زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت اور خلاقانہ وفکری بصیرت کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ انھوں نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا، انتہائی اعتماد کے ساتھ اٹھایا جس میں تحقیق وتلاش وجستجو کا عمل کارفرما رہا۔ انھوں نے پرانے موضوعات پر نئے گوشوں کو تلاش کیا۔

پروفیسر عبدالقوی دسنوی 92-1991 میں مدھیہ پردیش اردو اکادمی، بھوپال کے سیکریٹری بھی رہے۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی حیات میں ہی ان کی شخصیت اور مختلف رسائل میں گوشے اور خصوصی نمبر شائع ہوئے: ''کاروان ادب'' (ایڈیٹر کوثر صدیقی اور محمد نعمان خاں) نے عبدالقوی دسنوی ایک مطالعہ، کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی۔ دسنوی صاحب کی وفات کے بعد 2013 میں ایک ضخیم کتاب: ''عبدالقوی دسنوی- حیات اور خدمات، شائع ہوئی۔

عبدالقوی دسنوی کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات کے بھی معترف ہیں۔ انھوں نے اردو تحقیق وتنقید میں نئے نئے موضوعات شامل کر کے تنقید میں توازن اور اعتدال پیدا کر کے دوسروں کے لیے فکر وتحقیق کی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔

تنقیدی محاکمہ

دسنوی صاحب نے جس وقت اردو تنقید کی طرف توجہ کی وہ ترقی پسند تحریک کے شباب کا زمانہ تھا۔انھوں نے اس تحریک کے نشیب وفراز کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔خود دسنوی صاحب بمبئی میں جاں نثار اختر،کیفی اعظمی،مجروح سلطان پوری،راجندر سنگھ بیدی اور علی سردار جعفری وغیرہ کی صحبتوں میں رہا کرتے تھے۔ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کی تخلیقات نے دسنوی صاحب کو کافی متاثر کیا،ان میں جاں نثار اختر،پرویز شاہدی،مجروح،ساحر،فراق،فیض کے نام شامل ہیں۔ دسنوی صاحب کی تنقید میں شعور کی بالیدگی ملتی ہے۔ان کے یہاں کسی قسم کی نظریاتی سخت گیری کو دخل نہیں بلکہ اس میں فکر ونظر میں وسعت اور گہرائی ملتی ہے جو معاصرانہ تنقیدی ادب کے مطالعے سے وجود میں آیا۔بقول پروفیسر عتیق اللہ:

> ''عبد القوی دسنوی مرحوم نے ادب کی تفہیم کے ضمن میں ایسی کسی بھی قسم کی حد بندی کو ترجیح نہیں دی ہے جو ان کی ذہنی آزادیوں کی راہ میں مانع ہو۔ان کے نزدیک تخلیق کے تقاضوں کی خاص اہمیت ہے۔۔۔بنیادی طور پر ایک استادِ ادب ہونے کے ناطے انھیں اپنی ذمے داریوں کا بخوبی احساس تھا اسی لیے تنقید ان کے یہاں تنقید سے زیادہ تفہیم کا حکم رکھتی ہے۔۔۔گویا نقاد کسی منبر پر کھڑے ہو کر نہ تو

اعلان نما دعوے کرتا ہے اور نہ ہی اپنے عصا سے ڈراتا، دھمکاتا ہے بلکہ معنی کے امکانات کی جستجو اور تفہیم کے عمل کی دشواریوں کو دور کرنا ہی اس کے مقاصد کی فہرست میں اولیت کا درجہ رکھتا ہے، قوی صاحب کی ترجیحات میں بھی اسی مقصد کو اولیت حاصل ہے۔"

عبدالقوی دسنوی کے تنقیدی افکار پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر محمد نعمان خاں لکھتے ہیں۔

"اردو تنقید میں عبدالقوی دسنوی کا رویہ حقیقت پسندانہ ہے، وہ فن پارے کے پس منظر اور تمام تر تحرکات پر نظر رکھ کر فنکار کے مزاج و ماحول کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں۔ موضوع کے متعلق عوامل کا انھیں بخوبی احساس ہے۔ ان کی تنقید کسی خاص نظریے کی ترجمان نہیں ہے بلکہ موضوع سے متعلق تمام ضروری تفصیلات کی چھان بین کا ماحصل ہے جس میں موضوع کا تاریخی و سماجی پس منظر اور فنی خصوصیات کے التزام کی پرکھ بھی شامل ہوتی ہے۔"

اپنی کتاب 'اردو شاعری کی گیارہ آوازیں' میں انھوں نے اس کی وضاحت بھی کی ہے لکھتے ہیں:

"شعرائے اردو سے متعلق یہ گیارہ مضامین میں نے مختلف وقتوں میں مختلف ضرورتوں کے تحت لکھے ہیں۔ یہ تمام شعرا مجھے کسی نہ کسی طرح پسند رہے ہیں.... یہ شعرا مختلف وقتوں میں مختلف مقامات سے اپنی آواز بلند کرتے رہے ہیں اور اپنے جذبات وافکار سے باخبر کرتے رہے ہیں اور اپنی آواز میں اپنی پہچان کراتے رہے ہیں۔ یہاں میں نے اپنے طور پر انھیں پہچاننے کی کوشش کی ہے۔"

ڈاکٹر سید حامد حسین نے دسنوی صاحب کی تنقید سے متعلق صحیح لکھا ہے:

"پروفیسر دسنوی کا تعلق دراصل تنقید کی اس محتاط کل اور شریف روایت سے ہے جن کی داغ بیل مولانا الطاف حسین حالی اور مولوی عبدالحق نے ڈالی تھی۔"

(ماخوذ: 'عبدالقوی دسنوی حیات اور خدمات' مرتبہ محمد نعمان، کوثر صدیقی، آفاق حسین صدیقی۔ ص 401)

دسنوی صاحب کی تنقیدی بصیرت کو سمجھنے کے لیے مہدی افادی کی خط نگاری سے متعلق یہ اقتباس پیش کیا جارہا ہے جس میں انھوں نے غالب کی خط نگاری کا موازنہ کرتے ہوئے متوازن رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''مہدی کے یہ تمام خطوط اپنے زمانے کی ادبی تاریخ بھی ہیں اور قابل رشک ادب پارہ بھی۔ ان میں ان کی زندگی کی دھوپ چھاؤں بھی محفوظ ہے اور ان کے مزاج، عادات، دلچسپیوں، وابستگیوں، پسند ناپسند تنقیدی شعور اور جمالیاتی حسن کی ترجمانی بھی ہے۔ لیکن میں ان لوگوں سے قطعی متفق نہیں ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ مہدی نے خط نگاری میں غالب کی عظمت کو چھولیا ہے۔ بلکہ ان سے بھی آگے آگے نظر آتے ہیں۔ اس طرح کے خیالات گمراہ کن ہیں۔ غالب اور مہدی کے مزاج، افکار، حالات اور زمانہ میں بڑا فرق ہے جن کا اثر ان کے خطوط پر نمایاں ہے۔ غالب کے یہاں تنوع ہے۔ مہدی کے یہاں بہت حد تک یکسانیت ہے۔ غالب کے خطوط میں عام طور سے گفتگو کی شگفتہ فضا ہے۔ مہدی کے یہاں ان کی کمی ہے۔ غالب سادگی کے علمبردار ہیں۔ مہدی (صحیفۂ محبت کے خطوط کو چھوڑ کر) پرکاری کے شائق ہیں۔''

(ماخوذ: 'عبدالقوی دسنوی حیات اور خدمات' مرتبہ محمد نعمان، کوثر صدیقی، آفاق حسین صدیقی: ص 407)

پروفیسر دسنوی بنیادی طور پر محقق تھے ان کی بیشتر تصانیف اور مضامین تحقیقی نوعیت کے حامل تھے۔

بقول ڈاکٹر سید حامد حسین:

''تنقید پروفیسر دسنوی کی ترجمانی ادب کا ایک پہلو ہے جسے ان کی تحقیق، تبصرہ، جائزہ اور تاریخ نگاری کے مشاغل سے الگ کرکے دیکھنا اکثر دشوار ہوجاتا ہے۔ پروفیسر دسنوی کا تعلق دراصل تنقید کی اس محیط کل اور شریف روایت سے ہے جس کی داغ بیل مولانا الطاف حسین حالی اور مولوی عبدالحق نے ڈالی تھی۔ حالی اور عبدالحق کی طرح وہ زیر بحث موضوع کی مختلف پہلوؤں سے پوری طرح چھان بین کو اپنا

فریضۂ فکر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تنقیدی تحریرات کو خالص نظریاتی مبحث سے دور رکھتے ہیں۔ ان کی توجہ اس امر پر رہتی ہے کہ وہ موضوع سے متعلق ضروری تفصیلات کی پوری چھان بین کے بعد اہم نمونوں کو سامنے رکھتے ہوئے اور تاریخی پس منظر سے رہنمائی حاصل کر کے ایک واضح تصویر تیار کرسکیں۔''

(ماخوذ: 'عبدالقوی دسنوی حیات اور خدمات' مرتبہ محمد نعمان، کوثر صدیقی، آفاق حسین صدیقی: ص 401)

پروفیسر عبدالقوی، محقق و نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ کامیاب اشاریہ نگار بھی تھے۔ ڈاکٹر فاروق انصاری ان کی اشاریہ سازی سے متعلق اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا شمار ان مایۂ ناز شخصیتوں میں کیا جاتا ہے جنھوں نے اردو کی خدمت کو اپنا نصب العین سمجھا بھی اور نصب العین بنایا بھی۔ وہ ایک مثالی استاد اور صاحب طرز ادیب، اچھے ناقد اور معتبر محقق بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ غالبیات، اقبالیات، ابوالکلامیات، انیسیات، سلیمانیات اور بھوپالیات سے متعلق ان کی دو درجن سے زیادہ تصانیف موجود ہیں۔ انھوں نے مہدی افادی، پریم چند، میر انیس، سلامت علی دبیر، حسرت موہانی جیسی ادبی شخصیات کی خدمات سے متعلق بھی کئی تصانیف چھوڑی ہیں۔

عبدالقوی دسنوی صاحب اردو تحقیق میں اشاریہ سازی کی اہمیت کو دل سے تسلیم کرتے تھے اور یہی سبب تھا کہ انھوں نے اس جانب توجہ کی۔

پروفیسر محمد نعمان خاں نے اپنی کتاب ''سرمایۂ ادب' میں عبدالقوی دسنوی کے ساتھ اشاریوں کی فہرست فراہم کی ہے۔ یہ اشاریے ہیں: 'غالبیات' جسے نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے 1969 میں شائع کیا، 'انیس نما' سیفیہ کالج، بھوپال سے 1973 میں شائع ہوئی۔ 'ہندوستان میں اقبالیات' کو اقبال اکادمی، لاہور سے 1976 میں شائع کیا گیا۔ 'اشاریۂ پریم چند' کتاب نما کے خصوصی شمارے میں 1981 میں شائع ہوا تھا اور جسے بعد میں مکتبہ جامعہ، نئی دہلی نے 2011 میں کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ 'یادگار سلیمان' کو بہار اردو اکادمی نے 1984 میں اور 'یادگار آزاد' کو اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ نے 1988 میں شائع کیا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر گیان

چندجین نے اپنے مضمون میں ''اشاریہ مرزا سلامت علی دبیر'' اور مضمون کی شکل میں سید احتشام حسین اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے اشاریوں کی نشاندہی کی ہے۔

'غالبیات' کو نسیم بک ڈپو، لکھنؤ نے 1969 میں شائع کیا تھا۔ یہ تین سو اٹھارہ صفحات پر مشتمل حوالہ جاتی کتب کے سلسلے کی ایک تالیف ہے جس میں غالب سے متعلق ہر نوعیت کی تحریروں کے بارے میں تمام تر ممکنہ مواد جمع کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مذکورہ کتاب گیارہ ابواب اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے'' کچھ غالبیات کے بارے میں'' عنوان کے تحت پروفیسر عبدالقوی صاحب نے اپنے پیش روکی کاوشات کا اعتراف کیا اور 'غالبیات' کو غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال کی اولین پیشکش قرار دیا ہے۔

غالبیات میں کسی خاص کتاب یا تمام مضامین کی درجہ بندی کے لیے جو طریقۂ کار اپنایا گیا ہے، وہ بہت ہی جامع اور سائنٹفک ہے۔ مختلف ناقدین اور علمائے ادب نے غالب کے متعلق وقتاً فوقتاً جو مضامین لکھے ہیں اور وہ جن جرائد و رسائل میں شامل ہیں، ان کی نشاندہی نثری مجموعے بہ ترتیب مضمون نگار، نثری مجموعے بہ ترتیب، موضوع؟ رسائل واخبارات بہ ترتیب مضمون نگار؛ رسائل واخبارات بہ ترتیب موضوع؛ مکالمے، خاکے، ڈرامے ریڈیائی ڈرامے، تمثیلیں بہ ترتیب قلم کار؛ مکالمے خاکے، ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، تمثیلیں بہ ترتیب نگارشات؛ نظمیں، غزلیں بہ ترتیب موضوع کے ذیل عنوانات کے تحت کی گئی ہے۔

نثری مجموعے بہ ترتیب مضمون نگار کے تحت کسی مضمون نگار نے کل کتنے مضامین لکھے ہیں اور وہ خود اس کے یا دوسروں کے مرتب کیے ہوئے کن کن مجموعوں میں شامل ہیں، کا ذکر کیا گیا ہے۔ نثری مجموعے بہ ترتیب موضوع عنوان کے تحت کسی خاص عنوان سے لکھا ہوا کوئی مضمون، کس مضمون نگار کا ہے اور وہ کسی مجموعے میں شامل ہے، کا ذکر ہے۔ رسائل واخبارات بہ ترتیب مضمون نگار کے تحت کسی خاص مضمون نگار کے کل کتنے مضامین کس کس عنوان سے کس رسالے کے کن کن شماروں میں شائع ہوئے ہیں، کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ رسائل واخبارات بہ ترتیب موضوع کے تحت کسی خاص عنوان سے لکھا ہوا کسی مضمون نگار کا کوئی مضمون کسی رسالے کے کس شمارے میں شامل ہے، کو ظاہر کرتا ہے۔ مستقل تصانیف اور مضامین و مقالات کے علاوہ غالب سے متعلق ان

تمام چھوٹی بڑی مختلف النوع تحریروں کو بھی جمع کیا گیا ہے جو اس وقت تک منظر عام پر آ چکی تھیں۔ انھیں مکالمے، خاکے، ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، تمثیلیں بہ ترتیب قلم کار اور مکالمے، خاکے، ڈرامے، ریڈیائی ڈرامے، تمثیلیں بہ ترتیب نگارشات کے تحت درجہ بند کیا گیا ہے۔ شعری کارناموں کی نظمیں، غزلیں، بہ ترتیب شعرا اور نظمیں، غزلیں، بہ ترتیب موضوع کے تحت فہرست سازی کی گئی ہے۔ کلامِ غالب سے متعلق کتابوں پر لکھے گئے تبصروں کو 'تبصرے بہ ترتیب تصانیف' کے تحت جمع کیا گیا ہے۔ آخر میں کتابیات کے ذیل میں ان کتابوں، رسائل اور اخبارات کی فہرست فراہم کی گئی ہے جو غالب اور عہدِ غالب سے متعلق بیش قیمت معلومات فراہم کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ 'غالبیات' کی اشاعت کے بعد سے اب تک اس موضوع پر خاصا وقیع اور قابلِ لحاظ کام ہو چکا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہی سبب ہے کہ پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے ایک مقالہ 'غالب سے متعلق اشاریہ سازی' قلم بند کیا تھا جو غالب نامہ، نئی دہلی کے جنوری تا اپریل 1976 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالے میں غالبیات سے متعلق موجود اشاریوں کا احاطہ کر کے اشاریہ سازی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

'ہندستان میں اقبالیات' پہلے اقبال ریویو، لاہور کے جولائی 1976 کے شمارے میں شائع ہوا اور بعد میں اقبال اکادمی، لاہور نے 1976 میں اسے کتاب کی شکل میں شائع کیا۔ اس میں ہندستانی مصنفین کی ان تحریروں کے حوالے شامل کیے گئے ہیں جو ہندستان یا پاکستان کے رسائل یا اخبارات میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ پاکستانی اہلِ قلم کی صرف ان تحریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہندوستان سے نکلنے والے رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر 'ہندوستان میں اقبالیات' ہندوستان میں شائع ہونے والے ان مضامین کا اشاریہ ہے جو علامہ اقبال کے فکر وفن سے تعلق رکھنے والے مضامین کا احاطہ کرتا ہے۔ عبدالقوی دسنوی صاحب نے بڑی محنت سے تمام مضامین کو جمع کر کے ان کی درجہ بندی کی ہے۔ انھوں نے اقبال نمبروں اور کتابوں پر چھپنے والے تبصروں حتیٰ کہ اخبارات میں شائع ہونے والے بعض مراسلوں اور خبروں کی فہرست بھی اس اشاریے میں شامل کر دی ہے۔ کتاب کے آخر میں ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں اس موضوع پر کیے جانے والے تحقیقی کاموں کی فہرست درج کی گئی ہے۔ بلاشبہ دسنوی صاحب کی یہ

تصنیف اقبالیات سے متعلق ایک جامع اشاریے کی حیثیت رکھتی ہے۔

'یادگار آزاد' مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی علمی و ادبی خدمات سے متعلق اشاریہ ہے جسے اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ نے 1988 میں شائع کیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین میں، خطوط، مقدموں، پیش لفظ اور تقریظوں کے عناوین وہ کہاں اور کب چھپے، کی مکمل فہرست 'تحریریں'' عنوان کے تحت درج کی گئی ہے۔ اس فہرست پر نظر ڈالتے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا آزاد کا پہلا مضمون 'فن اخبار نویسی' ماہنامہ مخزن، لاہور کے مئی 1902 کے شمارے میں شائع ہوا تھا اور ان کی آخری مطبوعہ تحریر 'البیرونی اور جغرافیہ عالم' تھی جس کا مسودہ آزاد بھون کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اسی عنوان کے تحت مولانا آزاد کے خطبات اور تقریروں کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ بعض مضامین ایسے بھی ہیں جو پہلے کہیں اور چھپے تھے اور وہاں سے نقل ہو کر دوسری جگہ شائع ہوئے ہیں۔ ایسے مضامین پر مولانا آزاد کی وفات کے بعد کی تاریخیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔

'مہدی حسن افادی از عبدالقوی دسنوی' جنوری 1977 میں نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے شائع کی گئی تھی۔ اس کتاب کے آخری حصے میں 'مہدی نظر نظر میں' عنوان کے تحت ایک اشاریہ شامل ہے جو مہدی حسن افادی سے متعلق لکھے گئے مضامین کا احاطہ کرتا ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔

'پریم چند از عبدالقوی دسنوی' منشی پریم چند کا اشاریہ ہے جسے مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے 2011 میں کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس سے قبل کتاب نما نئی دہلی کے 1981 اور نگار، کراچی کے اگست/1985 کے شماروں میں 'دھنپت رائے نواب رائے، پریم چند'' کے نام سے اسے شائع کیا جا چکا ہے۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصہ حیات نامۂ پریم چند کے نام سے ہے جس میں پریم چند کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک کے تمام واقعات اور تصانیف کو ترتیب وار درج کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ تصانیفِ پریم چند، پریم چند پر رسائل کے نمبر، پریم چند سے متعلق کتابیں پریم چند پر مقالات، پریم چند پر تحقیقی کام وغیرہ ذیلی عنوانات کے تحت تمام معلومات کو یکجا کیا گیا ہے۔ آخر میں نقد پارے کے عنوان سے اہم نگارشات کو بطور حوالہ شامل

کیا گیا ہے جو پریم چند کے حوالے سے مختلف رسائل میں اہل قلم حضرات نے قلم بند کیے ہیں۔''

قوی صاحب نے غالب، اقبال، انیس، پریم چند، ابوالکلام اور سلیمان ندوی سے متعلق کتابوں کی جو فہرست شائع کی ہے وہ اردو میں اشاریہ سازی کے بہترین نمونے ہیں۔ ان کے مرتب کردہ چھے اشاریے مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) غالبیات، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1969۔

(2) انیس نما 1973۔

(3) ہندوستان میں اقبالیات، پاکستان 1976۔

(4) کتاب نما، دہلی کے مرزا دبیر نمبر 1977 میں دبیر کا اشاریہ 'مرزا سلامت علی دبیر' کے عنوان سے آیا۔

(5) کتاب نما ہی کے 1981 کے خصوصی شمارے میں پریم چند کا اشاریہ 'دھنپت رائے نواب رائے پریم چند' شائع ہوا۔

(6) اس کے علاوہ مہدی افادی سید احتشام حسین اور خلیل الرحمن اعظمی پر اشاریے مضمون کی شکل میں شائع ہوئے۔

قوی صاحب نے اردو ادب میں اشاریہ سازی جیسے مشکل اور صبر آزما کام کی جو طرح ڈالی وہ قابل قدر اور قابل تقلید ہے۔ انھوں نے انیس، دبیر، غالب، پریم چند، ابوالکلام آزاد اور اقبال پر کیے گئے کام کو منضبط کیا اور حاشیے تحریر کیے۔ دسنوی صاحب کے مذکورہ بالا اشاریے رسرچ اسکالرس کے لیے ہمیشہ رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔

قوی صاحب اور بھوپال

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ قوی صاحب کا آبائی وطن دسنہ تھا لیکن بھوپال سے محبت نے انھیں آخری دم تک یہیں کا بنائے رکھا۔ بھوپال قوی صاحب کا وطن ثانی بن گیا جہاں انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ گزارا۔ بھوپال میں ان کے قیام کا زمانہ نصف صدی پر محیط ہے۔ قوی صاحب جس زمانے میں بحیثیت لکچرار بھوپال آئے۔ یہ زمانہ یہاں اردو کے لیے نامساعد حالات

کا زمانہ تھا۔ آزادی کے بعد ملک کی تحریک آزادی میں بنیادی رول ادا کرنے والی اردو زبان اب اپنے ہی دیار میں دشنام طرازی کا شکار تھی۔ ملک کی تقسیم نے تخلیقی ذہنوں اور دانشوروں کے اذہان پر بھی دراڑیں ڈال دی تھیں۔ جہاں زبان اپنے وجود کا احساس دلانے کے لیے تڑپ رہی تھی وہیں بھوپال کا سیاسی، معاشی اور سماجی منظر نامہ بدل چکا تھا۔ نئے مدھیہ پردیش کی تشکیل اور بھوپال راجدھانی بننے کے بعد یہاں کے سرکاری دفتروں اور دوسرے اداروں پر ہندی کا غلبہ شروع ہو چکا تھا۔ اردو مخالف رجحان اور ہندی کی مقبولیت نے طلبا میں ہندی تعلیم حاصل کرنے کا میلان پیدا کر دیا تھا۔ ان حالات اور فضا میں قوی صاحب بھوپال کے سیفیہ کالج میں بحیثیت اردو کے استاد بن کر آئے اور دل و جان سے اس کی خدمت میں لگ گئے۔ اس باد مخالف میں انھوں نے طلبا کو اردو زبان اور اردو تہذیب کی اہمیت کا احساس دلایا اور اپنی تمام تر قوت اور صلاحیتیں شعبۂ اردو کو سنوارنے اور طلبا میں ادبی و علمی ذوق پیدا کرنے میں صرف کیں۔ ان کی تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور تحریری صلاحیتوں کو ابھارا۔ قوی صاحب کو سیفیہ کالج سے حد درجہ انسیت تھی وہ سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کو ایک مثالی شعبہ بنانے کے آرزومند تھے اور ہر وقت اس کے فروغ کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ دسنوی صاحب نے سیفیہ کالج، طلبا، شعبۂ اردو اور بھوپال کو ایک مشن کے طور پر قبول کیا اور یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے اس مشن کو کامیاب بنائیں گے اور اپنے عمل پر کھرے اتریں گے۔

ایسا نہیں کہ بھوپال میں قوی صاحب کی کوئی مجبوری تھی۔ دوران ملازمت انھیں ملک کی کئی اہم یونیورسٹیوں سے ملازمت کے آفر ملے لیکن انھوں نے اسے یکسر رد کر دیا اور وفاداری بشرط استواری کے اصول پر عمل کرتے ہوئے سیفیہ کالج، شعبۂ اردو کے ہی ہو کر رہ گئے جسے انھوں نے اپنے خون جگر سے سینچا تھا اور جسے وہ اپنی بھوپال کی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔

سیفیہ کالج کا شعبۂ اردو، سیفیہ کالج کی لائبریری، شعبۂ اردو کی (ارمغانِ سیفیہ، مجلّہ سیفیہ، اور نوائے سیفیہ) مطبوعات اور ان مطبوعات میں بھوپال، بھوپال کا شعر و ادب اور بھوپال کے دانشوروں کو جس طرح انھوں نے محفوظ کیا وہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور یہ سب کچھ انھوں نے بڑی دیانتداری اور خلوص کے ساتھ کیا۔ جس میں اُن کا کوئی ذاتی مفاد شامل نہیں تھا۔ شاید اسی بنا پر انھوں نے یہ لکھا تھا کہ

"سرزمین بھوپال کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں ہر زمانے اور ہر دور میں ملک کے باکمالوں کی قدر ہوتی رہی ہے۔ شاید اس زمین کی مردم شناسی اور قدر افزائی کی وجہ سے اہل علم حضرات کی آمد کا سلسلہ یہاں جاری رہا۔"

قوی صاحب نے اپنی تحریروں میں بھوپال سے اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اسے اکثر اپنے خوابوں کی سرزمین کہا ہے اور اس کی وجہ یہ بھی تھی گرچہ ان کی بھوپال آمد سے قبل کئی تصانیف اور کئی مضامین شائع ہو چکے تھے لیکن ان کا اصل میدان عمل بھوپال ہی تھا جہاں انھوں نے تحقیق و تنقید، ترتیب و تدوین کی اور اشاریہ سازی پر 7 کتابیں اور تقریباً 300 سے زائد مضامین لکھے۔

یعقوب یاور قوی صاحب کے بھوپال آکر بسنے اور بھوپال میں ان کے علمی و ادبی کارناموں سے بھوپال کے ادب پر اثرات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لوگ کچھ بھی کہیں لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ برصغیر اور دنیائے اردو ادب کی سطح پر بھوپال کے علمی مرتبے کے تعین اور اس کی بازیابی کے لیے جو خدمات قوی صاحب نے انجام دی ہیں انھیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔"

قوی صاحب نے 19/فروری 1961 کو بھوپال کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اکثر لوگ معاش کے سلسلے میں کسی جگہ سے جڑتے ہیں اور پھر سبکدوشی کے بعد اس جگہ کو خیر باد کہہ دیتے ہیں لیکن قوی صاحب نے بھوپال کو ہی اپنا وطن بنالیا وہ 1990 میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے اور یہیں کے ہو رہے۔

سرزمین بھوپال پر قوی صاحب کے قدم نے بھوپال کے میدان ادب کو گل و گلزار بنادیا۔ سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کا فروغ اور بھوپال کے عنوان سے ماسٹر اختر لکھتے ہیں:

"انھوں نے اپنا آرام و آسائش اور سکون و خواہشات کو ختم کر کے اپنی تمام کی تمام عمر کو نذر بھوپال کر دیا۔ یہیں کی خاک سے جڑ کر۔ یہیں کی آب و ہوا میں سانس لے کر اور یہیں کے شب و روز میں اپنے عمل اور اپنی ادبی سرگرمیوں سے وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن سے لامحالہ بھوپال کا نام بھی روشن ہوا۔"

قوی صاحب کو بھوپال سے قلبی، ذہنی و عملی لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ان تمام افراد

واقعات کو جن سے بھوپال کی ادبی شان میں اضافہ ہوتا ہے لوگوں کی نگاہ میں لانے کی عملی تخلیقی کوششیں کیں۔ جس کا ثبوت ان کی تصانیف 'نذر سجاد'، نذر تخلص، فخر نامہ، ارمغان سیفیہ، نوائے سیفیہ اور مجلّہ سیفیہ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔

قوی صاحب اور سیفیہ کالج

21 فروری 1961 کو انھوں نے اس کالج میں درس وتدریس کی ذمّے داری سنبھالی اور 1967 تک یعنی چھے سال کے مختصر عرصے میں سیفیہ کالج کا شعبۂ اردو عام ہندستانیوں میں اپنی شناخت قائم کر چکا تھا۔ ابتدا میں سیفیہ کالج میں صرف B.A تک اردو کی تعلیم دی جاتی تھی لیکن قوی صاحب کی کوششوں سے 1968 میں یہاں پوسٹ گریجویٹ کی تعلیم دی جانے لگی اور پھر Ph.D کا سلسلہ شروع ہوا۔ انھوں نے اپنی گراں قدر کاوشوں اور جہد مسلسل سے اسے ایسا وقار بخشا کہ بھوپال کی علمی وادبی زندگی ان کی صحبت سے مالا مال ہوگئی۔

قوی صاحب کی آمد سے پہلے سیفیہ کالج بھی ایک عام سی درسگاہ تھی۔ جہاں حصول علم کے خواہاں ڈگریاں حاصل کرنے آتے تھے اس سے زیادہ سیفیہ کالج کو کوئی خاص حیثیت حاصل نہ تھی لیکن قوی صاحب کی آمد نے زبان وادب کے تعلق سے اس میں نئی روح پھونکی اسے نئی سمتوں سے روشناس کرایا اور سیل گریہ سے نکال کر حرف تقدس کا التفات دیا۔

اردو زبان سے محبت اردو والوں کی سربلندی کی خواہش اپنے طلبا کو کامیاب دیکھنے کی تمنا اور شعبۂ اردو کی ترقی کی لگن انھیں بنا تھکے ہنا رکے مسلسل کام کرتے رہنے پر آمادہ رکھتی تھی۔ کالج سے نکلنے والے میگزین مجلّہ سیفیہ اور نوائے سیفیہ محض کالج میگزین نہ ہو کر باقاعدہ معیاری جریدوں کی حیثیت اختیار کر گئے تھے اس کے خصوصی نمبرات اور دسنوی صاحب کی دیگر اہم مطبوعات نے سیفیہ کو ہی نہیں بلکہ بھوپال کو اردو ادب کی تاریخ میں بلند مقام پر لا کھڑا کیا۔

ان کی بیش بہا تحقیقی کتب اور مضامین نے دیگر ادبی شخصیات کے علاوہ بھوپال کو بھی اردو ادب کی تاریخ میں سربلندی عطا کی۔ شعبۂ اردو کی زیارت سے فیض یاب ہونے کے بعد ادب کی مقتدر ہستیوں نے اس کے بارنے میں جو اظہار خیال کیا ہے اور قوی صاحب کی کثیر الجہات

شخصیت اور ان کی محنتوں اور کوششوں کو جس طرح سراہا وہ نا قابل بیان ہے۔ چند مشاہیر کے تاثرات پیشِ خدمت ہیں۔ جاں نثار اختر اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں کہ اس وقت سیفیہ کالج کی اردو انجمن سب سے اہم اور نمایاں ہے اور مجھے یہ کہنے میں بھی جھجک نہیں کہ سب کچھ قوی دسنوی صاحب کی ذات سے ہے۔ میری نیک خواہشات ہمیشہ اس انجمن اور دسنوی صاحب کے ساتھ رہیں گی۔''

پروفیسر گوپی چند نارنگ سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی فرماتے ہیں۔

''کوئی بھی شعبہ اپنے لوگوں اور اپنے سربراہ سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کی ایک مثال پروفیسر عبدالقوی دسنوی بھی ہیں۔ انھوں نے پوری زندگی اردو تحقیق میں کھپا دی ہے۔ مجلّہ سیفیہ نے اردو کی جو خدمت کی ہے اور غالب اور اقبال پر انھوں نے جو کام کیا ہے وہ دوسروں کے لیے نشانِ راہ کا حکم رکھتا ہے۔ خدا ان کی ہمت کو جوان رکھے اور اس شعبہ میں ان کا فیضان برابر جاری رہے۔ سیفیہ کے طلبا اردو کے سفیر بن کر دوسری یونیورسٹیوں میں اردو کے چراغ روشن کرتے رہیں۔''

کیفی اعظمی جن سے قوی صاحب کو دورانِ طالب علمی میں بھی قربت رہی اور وہ جب بھوپال آئے اور سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو میں مدعو کیے گئے تو انھوں نے اپنے تاثرات اس طرح قلمبند کیے:

''بھوپال یوں تو مجھے ہمیشہ عزیز رہا اور یہاں آکے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے لیکن جب سے میرے یہاں بہت عزیز نوجوان دوست عبدالقوی دسنوی ہیں اور ان کے زیرِ تربیت ایک پوری نوجوان نسل اپنی تہذیب اور اپنے ادب کی آبیاری میں خلوص کے ساتھ لگی دیکھ کے بے حد خوش ہوں اور یہ یقین ہوا کہ حالات لاکھ ناموافق ہوں لیکن اردو زبان اور اردو زبان کی ترقی، ادبی تحریک اب زیادہ رواں دواں ہے اور زندہ رہے گی یہ امید اور یقین کی دولت میں بھوپال سے اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔''

پاکستان کے معروف شاعر احسن علی خاں نے اپنی مسرت کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''شعبۂ اردو کو دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ صدر شعبۂ اردو عبد القوی دسنوی صاحب نے اردو اور شعبۂ اردو کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ وہ ایک مخلص انسان ہیں۔ قابل اور محنتی استاد اور دیانت دار محقق ونقاد ہیں۔ اردو بھوپال اور سیفیہ کالج خوش قسمت ہیں کہ انھیں دسنوی صاحب کی خدمات میسر ہیں۔ ان کی زیرِ قیادت شعبۂ اردو میں جو کام ہوا ہے وہ کسی بھی یونیورسٹی کے لیے قابلِ فخر ہو سکتا ہے۔''

قوی صاحب کو اردو اور سیفیہ کالج سے بے حد محبت تھی۔ قوی صاحب کی کوئی خواہ کتنی بھی مخالفت کر لے جواب میں ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالتے لیکن اگر کسی نے اردو یا سیفیہ کالج کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو قوی صاحب خاموش نہیں رہتے تھے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''اردو اور سیفیہ کالج قوی صاحب کی دکھتی ہوئی رگیں ہیں بہت سے لوگوں نے انھیں ذاتی طور پر نقصان پہنچائے ہیں اور تکالیف دی ہیں۔ ایسے اصحاب کے لیے ان کی زبان پر حرف شکایت بہت کم آتا لیکن کوئی اردو زبان سے یا سیفیہ کالج سے بے انصافی کرے یا بے اعتنائی برتے یہ قوی صاحب کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔''

1990 میں اپنی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی ان کا دل اور ان کی روح اس شعبہ سے جڑی رہی، وہ اسے چاہ کر بھلا نہ پاتے تھے۔ سیفیہ کالج سے سبکدوشی کے بعد اپنے جذبات کا انھوں نے جس دردمندی کے ساتھ اظہار کیا ہے وہ اس بات کا غماز ہے کہ اس شعبے سے ان کا لگاؤ کس حد تک تھا۔ لکھتے ہیں:

''میرا شعبہ مجھے بار بار یاد آتا ہے۔ اکثر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شعبہ کا دروازہ منتظر آنکھوں کی طرح کھلا ہوا میری طرف تاک رہا ہے۔ الماریاں خاموشی کے ساتھ کھڑی ہوئی مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں کرسیاں بھی اُداس اُداس بیٹھی ہوئی میری طرف تاک رہی ہیں اور کچھ شکایت کرنا چاہتی ہیں سب کو اس بات کا افسوس ہے کہ میں بہت دنوں سے ان کے درمیان نہیں آیا ہوں ان کے ساتھ نہیں بیٹھا ہوں ان کو

دیکھ کرنہیں مسکرایا ہوں ان سے باتیں نہیں کی ہیں ایسے وقت میں میری خاموشی
زبان بن کران سے پوچھتی ہے۔
میں تم سے کب جدا ہوا ہوں؟ کب تمھیں چھوڑ کر آیا ہوں؟ کب تم سے غافل ہوا
ہوں۔ تمھاری بیشتر کتابوں پر میری انگلیوں کے نشانات میری قربت محسوس کراتے
رہیں گے۔
تمام الماریاں میری شب و روز کی کہانی سناتی رہیں گی۔ شعبہ کے ہر گوشے میں
میرے خیالات اور جذبات بولتے ہوئے محسوس ہوں گے۔''

بھوپال میں قوی صاحب کی ادبی زندگی کا سلسلہ ان کی پہلی کتاب 'اور ہندوستان جاگ اٹھا' سے شروع ہوتا ہے جو 1963 میں شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال سے شائع ہوئی تھی۔ لیکن ان کی پہلی تحقیقی وتنقیدی کتاب 'علامہ اقبال بھوپال میں' ہے۔ اس بارے میں عموماً لوگوں کی یہ رائے رہی ہے کہ علامہ اقبال سے بے پناہ عقیدت اور جذباتی لگاؤ کی بنا پر قوی صاحب نے ان گوشوں کو نکالا۔ لیکن قوی صاحب کس حد تک قلبی، ذہنی وعلمی طور پر بھوپال سے وابستہ رہے اس کا ثبوت ان کی تصانیف، بھوپال اور غالب، نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی، ایک شہر پانچ مشاہیر، نذر سجاد، فخر نامہ، نذر مخلص، ارمغان سیفیہ اور نوائے سیفیہ کے تین بھوپال نمبر ہیں۔ وہ بھوپال کے ادبی وقار کو قائم رکھنے اور اسے اردو کی عالمی سرگرمیوں سے جڑے رکھنے کی دھن میں ہمیشہ سرگرداں رہے۔ ملک کی مقتدر ہستیاں اور مشاہیر ادب کی بھوپال آمد کو سیفیہ کالج میں مدعو کر کے انھوں نے بھوپال اور سیفیہ کالج دونوں کے وقار میں اضافہ کیا۔

بحیثیت اقبال شناس

ادب کی دنیا میں علامہ اقبال اور ان کی شاعری کا کون مداح نہیں۔ ہر کوئی اقبال کی فکر، بصیرت اور ان کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا شیدائی ہے لیکن علامہ اقبال سے قوی صاحب کی انسیت اور لگاؤ محض ادبی سطح تک نہیں بلکہ وہ اقبال کے افکار وخیالات سے زبردست ذہنی ہم آہنگی رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت کو نکھارنے اور علمی بصیرت پیدا کرنے میں اقبال کی فکر اور شاعری کا فیضان رہا

ہے۔اس کا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

''آج اگر میں یہ کہوں کہ مجھے زندگی کو سمجھنے، اسے برتنے، ناہمواریوں سے گزرنے اور دشوار و نا مساعد حالات کا مقابلہ کرنے کا جو حوصلہ ملا ہے، اس میں اقبال کی شاعری کو دخل حاصل ہے تو حرف بہ حرف صحیح ہوگا۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''میں نے اپنی زندگی کا ایک قیمتی حصہ شاعر مشرق علامہ اقبال کی زندگی کے بکھرے ہوئے لمحات کو سمیٹنے اور ان سے موجودہ زندگی کے لیے غور وفکر کے لمحات حاصل کرنے کی فکر میں صرف کیا ہے۔

مجھے اس دوران ایسا محسوس ہوا کہ شاعر مشرق کے ساتھ تماشائی بن کر نہیں بلکہ ان کی مسرتوں سے مسرور، احساس و جذبات سے متاثر اور رنج و کرب سے مضطرب رہا ہوں۔ان کی زندگی کے تمام ماہ وسال، روز وشب اوقات و لمحات سمٹ کر میری زندگی سے ہمکنار ہو گئے ہیں۔''

دسنوی صاحب نے اقبال کی فکر کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔

دسنوی صاحب کی اقبال شناسی دراصل اقبال کی اس فکر سے شناسائی ہے جسے انھوں نے اقبال کے ذہن کی تعمیر و آرائش سے تعبیر کیا ہے اور شاید یہی وجہ تھی کہ اقبال اور بھوپال سے لگاؤ نے دسنوی صاحب کو اہم کتابیں لکھنے پر مائل کیا۔ان کی پہلی با قاعدہ کتاب 'علامہ اقبال بھوپال میں' ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اقبال پر اور پانچ کتابیں تصنیف کیں:

1۔ اقبال انیسویں صدی میں، 1977

2۔ اقبال اور دلّی، 1978

3۔ بچّوں کا اقبال، 1978

4۔ اقبال اور دار الاقبال، بھوپال، 1983

5 اقبالیات کی تلاش 1984 اور ایک معلومات افزا اشاریہ 'ہندستان میں اقبالیات' 1976

اس کے علاوہ انھوں نے سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو میں گوشۂ اقبال کی بنیاد ڈالی اور اقبال

سے متعلق کتابوں کا ایک نادر ذخیرہ جمع کیا۔ اقبال پر جلسے وسمینار منعقد کرائے اور 1980 میں مجلّہ سیفیہ کا یادگار اقبال نمبر شائع کیا جو اقبالیات پر ان کی مرتب کردہ ایک اہم دستاویز ہے جس میں مختلف موضوعات پر اہم مضامین شامل ہیں۔

اس کے اداریے میں دسنوی صاحب نے توجہ دلائی تھی کہ بھوپال میں اقبال کی یادگار کو محفوظ کیا جائے۔ آج بھوپال میں 'اقبال ادبی مرکز' اور 'اقبال میدان' ان کی دیرینہ خواب کی ایک عملی تفسیر ہے۔

دسنوی صاحب نے اقبال پر تقریباً 24 تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ جن میں سے کچھ کو اقبالیات کی تلاش کے عنوان سے 1984 میں شائع کیا۔ ذیل میں اقبال پر لکھی ان کی کتابوں کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

'علامہ اقبال بھوپال میں' اقبال شناسی پر یہ ان کی پہلی کاوش ہے۔ جسے 1976 میں سیفیہ کالج بھوپال نے شائع کیا۔ حیات اقبال کے تعلق سے یہ بہت اہم کتاب ہے۔ ایک تو یہ کہ اس میں اقبال کی سوانح کے حوالے سے بہت سی اہم باتیں منظر عام پر آئیں۔ دوسرے یہ کہ اقبال اور بھوپال کے حوالے سے یہ کتاب 'خشتِ اول' کا درجہ رکھتی ہے۔ اقبال اور بھوپال کے تعلق سے قوی صاحب نے اپنی تحقیق کے مطابق اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اقبال نے اپنی پوری زندگی میں تین بار بھوپال کا سفر کیا۔ پہلی مرتبہ وہ 1935 میں بھوپال آئے اور 8 مارچ تک قیام کیا، پھر 17 / جولائی 1935 میں دوسری بار بھوپال آئے اور 9 / ستمبر تک قیام کیا اور پھر تیسری بار 2 مارچ 1936 میں بھوپال آئے اور 19 اپریل تک یہاں مقیم رہے۔ اس دوران ان کے بھوپال کے سفر وقیام کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے رفیع الدین ہاشمی نے (پاکستان کے معتبر محقق اور اقبال شناس) 1999 میں 'عبدالقوی دسنوی ایک اقبال شناس' کے عنوان سے اپنے مقالے میں لکھا ہے:

''علامہ اقبال بھوپال میں، (سیفیہ کالج بھوپال 1967) اقبالیات پر ان کی پہلی کاوش ہے۔ بھوپال سے علامہ کا بہت گہرا تعلق رہا ہے اور اس اعتبار سے 'اقبال اور بھوپال' اقبالیات کا نہایت اہم موضوع ہے۔ عبدالقوی دسنوی نے پہلی بار اس

موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بہت سی قیمتی اور نادر معلومات فراہم کیں۔اس کتاب کی دو حیثیتیں توجہ طلب ہیں۔ایک تو اس سے سوانح اقبال کے سلسلے میں بہت سی اہم باتیں ریکارڈ میں آ گئیں۔دوسری اہمیت یہ ہے کہ یہ کتاب اقبال اور بھوپال کے موضوع پر خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے۔''

بعد ازاں دسنوی صاحب نے اسے بعض نئی معلومات کے ساتھ توسیعی شکل میں 'اقبال اور دارالاقبال بھوپال' کے عنوان سے ایک نئی کتاب کی شکل میں پیش کیا۔یہ کتاب 1983 میں منظر عام پر آئی جسے نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔جس کی ہندوستان اور پاکستان دونوں ہی جگہ زبردست پذیرائی ہوئی۔

دسنوی صاحب کی کتاب 'علامہ اقبال بھوپال میں' پر ہند و پاک کے اردو رسائل میں کئی تبصرے شائع ہوئے تھے، ماہنامہ 'نگار' کراچی میں شائع تبصرہ ملاحظہ کیجیے:

''علامہ اقبال بھوپال میں'' ہر چند کے بہت مختصری کتاب ہے لیکن اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں اقبال کی شخصیت اور زندگی کے متعلق کچھ ایسی باتیں مل جاتی ہیں جو ہماری معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔برصغیر کی سیاسی و ادبی تاریخ کی بعض ایسی کڑیاں اس کتاب میں مل جاتی ہیں جن کا ذکر کسی دوسری جگہ نہیں آیا اور جن سے آشنائی کے بغیر ملی و ادبی تحریکوں کو سمجھنا مشکل ہے۔اگرچہ علامہ اقبال کا قیام بھوپال میں چند ماہ سے زیادہ نہیں رہا پھر بھی چونکہ سر راس مسعود اور نواب بھوپال دونوں سے اقبال کے ذاتی مراسم تھے اور مسلمانان پاک و ہند کی سیاسی و ملی تحریکوں سے ان تینوں کا گہرا تعلق تھا اس لیے اس مثلث کے خطوط و زاویوں کو سمجھنا ضروری ہے۔''

(ماخوذ: 'سرمایۂ ادب' مرتبہ ڈاکٹر محمد نعمان خاں، ص: 71-72)

1976 میں 'ہندوستان میں اقبالیات' کے عنوان سے ان کی دوسری کتاب منظر عام پر آئی۔یہ ایک اشاریہ ہے جسے اقبال اکادمی لاہور نے شائع کیا۔اسے قوی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کیا۔اس کتاب میں ہندستانیوں کی ان تحریروں کے حوالے شامل کیے گئے ہیں جو

ہندوستان، پاکستان یا پھر کسی دوسری جگہ شائع ہوئے ہیں۔

1977 میں اقبال پر ان کی کتاب 'اقبال انیسویں صدی میں' اقبال کی انیسویں صدی کی شاعری پر تحقیق وتنقید ہے۔ 1978 میں قوی صاحب کی ایک اور کتاب 'اقبال اور دلّی' منظر عام پر آئی اس میں اقبال کے تعلق سے جو باتیں بیان کی گئی ہیں وہ طبع شدہ ہیں لیکن عام نظروں سے نہیں گزری تھیں۔ قوی صاحب نے انھیں یکجا کر دیا ہے۔ یہ کتاب 120 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں مختلف شواہد کی روشنی میں اقبال اور دہلی، کے رشتے کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہ تصنیف اپنی نوعیت کے اعتبار سے واحد، معتبر اور مستند کتاب ہے۔ اقبال اور دلّی کے سفر کے حوالے سے قوی صاحب نے تفصیل سے ان کے دہلی کے سفر اور اس کے اسباب کا ذکر کیا ہے لکھتے ہیں:

> ''علامہ اقبال نے جب لاہور سے باہر قدم نکالا تو غالباً پہلا شہر دہلی ہی تھا جہاں کی سرزمین نے ان کو خوش آمدید کہا شاید اُن کی زندگی کا آخری شہر بھی دہلی تھا جہاں سے زندگی کے آخری ایام میں لوٹنے کے بعد کسی دوسرے شہر میں جانا نصیب نہیں ہوا۔''

('اقبال اور دلّی' ص: 8)

اسی سال یعنی 1978 میں ہی ان کی ایک اور کتاب 'بچوں کا اقبال' نسیم بک ڈپو، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب 86 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں بانگ درا کے پہلے حصے میں بچوں کے لیے لکھی گئیں نو نظموں کے علاوہ تین دوسری نظموں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ نظمیں کس رسالے میں پہلی بار چھپیں اور اس کی سنہ اشاعت کیا ہے، اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ ایسی نظموں میں 'ایک مکڑا اور مکھی'، 'ایک پہاڑ اور گلہری'، 'ایک گائے اور بکری'، 'ہمدردی'، 'ماں کا خواب'، 'پرندے کی فریاد'، 'بچے کی دعا'، کے علاوہ 'ایک پرندہ اور جگنو'، 'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'، 'عہد طفلی'، 'بچہ اور شمع'، 'طفلِ شیر خوار' وغیرہ کا فکری وفنی جائزہ لیتے ہوئے اس کی اہمیت اور معنویت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں مذکورہ جن نظموں کا تجزیہ پیش کیا ہے یہ تمام نظمیں اقبال نے بچوں کی فطرت کے حوالے سے لکھی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنی رائے بھی پیش کی ہے جس میں لکھا ہے:

''ان نظموں کے مطالعے سے ہمیں اقبال کے انسان کامل کی تلاش میں آسانی ہوتی ہے۔ وہ بچے کے ذہن کی تعمیر اس طرح کرنا چاہتے تھے جس سے وہ ایک ایسا انسان بن سکے جو خدا آگاہ ہو۔ صداقت شعار ہو، حریت پسند ہو، ہمدرد مجسم ہو، غرور وتکبر سے پاک ہو، محسن شناس ہو، خدمت گزار ہو، برائیوں سے پاک اور پیکر عمل ہو۔ ظاہر ہے اِن صفات کا حامل بچہ جوان ہو کر ویسا ہی انسان بنے گا جس کے اقبال خواہش مند تھے۔ اس لیے اردو میں بچوں کے ادب میں اقبال کی شاعری کے اس حصے کو ہمیشہ اہم مقام دیا جاتا رہے گا۔''

1984 میں قوی صاحب کی اقبال پر سب سے اہم کتاب 'اقبالیات کی تلاش' مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، دہلی سے شائع ہوئی۔ پوری کتاب 208 صفحات پر مشتمل ہے جس میں اقبال پر 9 مضامین شامل ہیں۔ یہ ان کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کو 1985 میں گلوب پبلیشر، اردو بازار، لاہور نے بھی شائع کیا۔ اس کے دیباچے سے ہی قوی صاحب کے احساسات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کی دیدہ ریزی اور عرق ریزی میں کون سے جذبات کارفرما تھے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''مجھے اس دوران میں ایسا محسوس ہوا ہے کہ شاعر مشرق کے ساتھ تماشائی بن کر نہیں بلکہ ان کی مسرتوں سے مسرور، احساس و جذبات سے متاثر اور رنج و کرب سے مضطرب رہا ہوں۔ ان کی زندگی کے تمام ماہ وسال روز وشب آنات ولحات سمٹ کر میری زندگی سے ہمکنار ہو گئے ہیں اور میں غیر مرئی صورت میں ان کے ساتھ رہا ہوں ان سے گرمی حاصل کرتا رہا ہوں اور ان کے قرب سے جس قدر فیضیاب ہو سکا ہوں انھیں تحریر میں لا کر آپ کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہوں۔''

بحیثیت غالب شناس

اقبال کے بعد اگر کسی شخصیت نے دسنوی صاحب کو متاثر کیا ہے تو وہ غالب ہیں۔ غالب سے دسنوی صاحب کی دلچسپی کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ 1969 میں غالب صدی کے موقع پر

ہندوستان کے ہر حصے میں غالب پر کچھ نہ کچھ لکھا جارہا تھا۔ لہٰذا سیفیہ کالج بھی اس سے الگ نہ رہا اور غالب صدی تقریبات کے انعقاد میں سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔
غالب کے تعلق سے دسنوی صاحب کی پانچ کتابیں ہیں:

1۔ غالبیات، 1969
2۔ بھوپال اور غالب، 1969
3۔ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی، 1970
4۔ نادرنامہ غالب، 1971
5۔ مطالعہ خطوط غالب، 1976

'غالبیات' یہ اشاریہ ہے جو کہ جنوری 1969 میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ 318 صفحات پر مشتمل ہے جس میں مقدمے کے علاوہ گیارہ ابواب اور ایک ضمیمہ شامل ہے۔ غالب کے سلسلے میں یہ ایک حوالہ جاتی کتاب ہے جس میں غالب سے متعلق ہر قسم کی تحریروں کے بارے میں اہم معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔

'بھوپال اور غالب' یہ غالب پر متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ جسے شعبۂ اردو سیفیہ کالج نے فروری 1969 میں شائع کیا۔ یہ کتاب 128 صفحات پر مشتمل ہے جس میں آٹھ مضامین شامل ہیں۔ دستیاب غالب کے قلمی نسخوں میں شامل کلام کا تعارف اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے جس کی وجہ سے غالب کی اصلاحوں، ترمیموں، محذوف شدہ شعروں اور غزلوں کو سمجھنے اور ان سے متعلق تحقیقی کام کرنے میں آسانی پیدا ہوگئی ہے۔ اس کتاب کو ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا اور رسائل میں تبصرے کیے گئے۔

غالبیات کے سلسلے میں دسنوی صاحب کا تیسرا قابل قدر کارنامہ 370 صفحات پر مشتمل مجلّہ سیفیہ کے غالب نمبر کی ترتیب و اشاعت ہے۔ جو 70-1969 کے تعلیمی سال کے دوران علوی پریس بھوپال میں چھپ کر شعبۂ اردو سیفیہ کالج سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں دسنوی صاحب کے ان لائق شاگردوں کی تحریریں بھی شامل ہیں جنھوں نے آج اردو ادب کے روشن میناروں میں اپنا مقام بنایا ہے اس وقت وہ بحیثیت طالب علم اپنے تعلیمی کیریئر کے ابتدائی دور سے گزر رہے تھے۔ بھوپال اور غالب میں بھوپال کے ان دس شاعروں کے

حالات دیے گئے ہیں جنھیں غالب کی شاگردی کا شرف حاصل تھا۔ کتاب کے آخر میں ''نمونہ مغلوبیت غالب، نسخۂ حمیدیہ اور چند مختصر مضامین ہیں۔ جن کے ذریعے غالب کے فکر وفن سے متعلق مختلف گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

قوی صاحب نے 1970 میں 'نسخۂ بھوپال' اور 'نسخۂ بھوپال ثانی' شائع کیا۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ سب رس حیدرآباد (نومبر 1971) میں شائع تبصرے کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

> ''پروفیسر دسنوی نے اس سلسلے میں جتنے مضامین اور مراسلے شائع کیے ان کے اختلافات بھی دیے ہیں اور نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی میں جو اصلاحیں ملتی ہیں اس کی بھی تفصیل دی ہے۔ آخر میں محذوفات کا بھی ذکر ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں جو مطبوعہ دواوین میں نہیں ملتے۔ لیکن بیاض غالب نقوش کی اشاعت کے بعد مقابلہ کر کے مختلف مضمون نگاروں نے ان کی تفصیلات مختلف رسائل میں دی ہیں۔ اس طرح نسخہ حمیدیہ اور نسخہ بیاض غالب، نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی کے متعلق تمام اختلاف ہمارے سامنے آتے ہیں اور کہیں ایک جگہ ہمیں اتنا مواد دستیاب نہیں ہوتا۔ اس طرح مختصری کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ہمیں پروفیسر دسنوی کا ممنون ہونا چاہیے انھوں نے دیوان غالب کا اس طرح ایک ایسا متن دیا جو ہمیں نسخۂ حمیدیہ، نسخۂ عرشی اور بیاض غالب سے بے نیاز کرتا ہے۔''

('سرمایۂ ادب' مرتبہ محمد نعمان ص:89)

غالب کے تعلق سے دسنوی صاحب کی ایک اور اہم کوشش 'قادرنامہ غالب' کی تدوین و اشاعت بھی ہے۔ یہ ایک مختصر منظوم رسالہ ہے۔ یہ رسالہ بھی فروری 1971 میں سیفیہ کالج کے شعبۂ اردو کی جانب سے شائع کیا گیا ہے۔۔

'مطالعہ خطوط غالب' 72 صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ ہے جو فروری 1975 میں انجمن اردوئے معلّٰی نے شعبۂ اردو سیفیہ کالج کی طرف سے شائع کیا۔ بعد میں اضافے کے ساتھ نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے 1979، 1978 میں شائع کیا۔ اس کتابچہ میں انھوں نے غالب کے خطوط کا

جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس کی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔

بحیثیت آزاد شناس

عبدالقوی دسنوی نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں تحقیق و تنقید کے جن موضوعات پر خاص توجہ صرف کی ہے ان میں سب سے زیادہ فوقیت مولانا آزاد کو حاصل ہے اگر چہ وہ اقبال، غالب، بھوپال سبھی سے اتنی گہری قربت رکھتے تھے جتنی کہ وہ خود اپنے آپ سے، اپنے فکر و خیالات سے اور اپنے محسوسات سے۔ جہاں اقبال کی فکر قوی صاحب کے محسوسات پر غالب رہی وہیں غالب اور غالب کی تصانیف نیز غالب کے شاگرد ان کے تعلق سے بھوپال کی اہمیت کو انھوں نے پیشِ نظر رکھا لیکن مولانا ابوالکلام آزاد وہ شخصیت تھے جن کے اوصاف و نگارشات نے قوی صاحب کو حد درجہ متاثر کیا۔

قوی صاحب مولانا آزاد کی ذات، ان کی طرزِ تحریر، ان کی صحافتی، سیاسی و ادبی و قومی خدمات سے متاثر رہے اور اپنے تصنیفی کارناموں میں مولانا آزاد کو خصوصی اہمیت دی اور ان پر 10 کتابیں تصنیف / تالیف و مرتب کیں اور مختلف رسالوں کے خاص نمبروں میں مضامین لکھے۔

دسنوی صاحب نے مولانا آزاد سے اپنی ذہنی قربت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''مولانا ابوالکلام آزاد سے میرا تعلق اس زمانے سے پیدا ہوا جب، انھوں نے اپنے گاؤں دسنہ (عظیم آباد) کے ہم عمر بچوں کے ایک کلب میں ''مولانا آزاد کی ایک خوبصورت تصویر...... کہیں سے حاصل کر کے لگائی تھی۔''
>
> انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا آزاد سے ان کے ابتدائی تعارف اور عقیدت کی بنیاد یہ تھی کہ وہ ''ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔''

(ماخوذ: 'مطالعہ غبار خاطر' ص: 7)

عبدالقوی دسنوی نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کو نہ صرف اپنے لیے ایک قابل تقلید شخصیت بنایا بلکہ وہ دوسروں کو بھی ان کے کارناموں سے واقف کرانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ چنانچہ

'حیات ابوالکلام آزادؔ کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

''بے شک ان کی زندگی کا ہر حصہ ہندستانیوں کے لیے بڑا قیمتی اور لائق تقلید ہے، ان کی زندگی اور ان کی خدمات سے ہر محبِ وطن ہندستانی کو باخبر رہنا چاہیے۔ تاکہ اس ملک میں حب الوطنی کے شجر ہمیشہ سرسبز رہیں۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب ہمارا ملک وطن دشمن عناصر کے برے عزائم سے اپنی حفاظت کی ہر ممکن کوشش کررہا ہے۔''

مولانا آزاد کی شخصیت اور خدمات پر قوی صاحب کی توجہ کا ابتدائی مرکز 'لسان الصدق' ہے۔ جس کے بعض مضامین مرتب کر کے 'لسان الصدق' کے عنوان سے 1967 میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ سے شائع کیے اور بعد میں اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔ مولانا آزاد پر مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری تھا کہ اسی دوران 1979 میں وزارت ثقافت حکومت ہند کی طرف سے مولانا آزاد پر کام کرنے کے لیے انھیں سینئر فیلوشپ ملی جس پر انھوں نے چند سالوں میں مواد جمع کر کے ایک ضخیم کتاب مکمل کرلی لیکن سرمایہ کی عدم فراہمی کی بنا پر اس کی بروقت اشاعت نہ ہوسکی۔

1981 میں انھوں نے 'مطالعۂ غبار خاطر' نئی آواز، دہلی سے شائع کی۔ یہ مولانا ابوالکلام آزاد پر ایک اہم تصنیف ہے۔ 'مطالعہ غبار خاطر' پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں اردو کے منفرد مکتوب نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی روشنی میں غبار خاطر کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ پہلے و دوسرے حصے میں خط نگاری اور اردو کے منفرد خط نگاروں کا ذکر ہے۔ تیسرے حصے میں غبار خاطر کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا ہے اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''غبار خاطر کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ مولانا کے ان خطوط میں زبان کی سلاست، خیال کی پاکیزگی، انداز کی ندرت اور بے ساختگی کی جلوہ گری کے ساتھ ساتھ مکتوب الیہ سے بڑی قربت اور اپنائیت پائی جاتی ہے۔''

چوتھے حصے و آخری حصے میں حیات ابوالکلام آزاد کی اہم تاریخیں درج ہیں جن کی بسا اوقات تصحیح کی کوشش کی لیکن اپنی کمی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حیات آزاد کی اہم تاریخیں، پیش کرتے ہوئے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ بعض تاریخوں کے سلسلے میں مستند حوالوں کے نہ ملنے کی وجہ سے وہی غلطیاں سرزد ہوگئیں

جو پیش روؤں سے ہوئی ہیں۔"

('مطالعۂ غبار خاطر' ص:166)

'مطالعہ غبار خاطر' میں دسنوی صاحب نے ان خطوط کو بھی شامل کیا ہے جن سے ان کے مزاج، کیفیات، تجربات اور خیالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی ازدواجی زندگی، جذبے کی شدت کا اظہار ہوتا ہے۔

1987 میں ساہتیہ اکادی دہلی سے 'ابوالکلام آزاد' کے نام سے قوی صاحب کی کتاب شائع ہوئی۔ یہ کتاب تین ابواب میں منقسم ہے۔ پس منظر، حیات و خدمات اور آخری باب کو بھی انھوں نے صحافتی، سیاسی وادبی اور علمی وادبی خدمات کے عنوان سے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

1988 میں دسنوی صاحب کی ایک اور کتاب 'مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی' بہار اردو اکادی، پٹنہ سے شائع ہوئی۔ اسی دوران مکتبہ جامعہ، دہلی سے مقدمے کے ساتھ 'لسان الصدق' کی طبع ثانی ہوئی اور پھر اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ سے 'یادگار آزاد' کی اشاعت ہوئی۔ یہ ایک اشاریہ ہے اس میں مولانا آزاد کی تصانیف سے متعلق بڑی جامع معلومات درج ہیں:

یادگار آزاد کے شروع میں مولانا آزاد کی حیات کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ تحریر کے عنوان سے مولانا آزاد کے مضامین، خطوط، مقدموں، پیش لفظ اور تقریروں کی فہرست دی گئی ہے کہ وہ کب اور کہاں چھپے ہیں۔ 1989 میں انھوں نے خدا بخش لائبریری پٹنہ سے مولانا آزاد کے دوسرے مشہور جریدے 'پیغام' کا نیا ایڈیشن شائع کیا۔ 1990 میں مولانا آزاد پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ 'تلاش آزاد' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب مہاراشٹر اردو اکادی بمبئی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔ اس کے بیشتر مضامین مولانا آزاد کی صحافتی و سیاسی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ صرف ایک مضمون ان کی شاعری پر ہے۔

1996 میں 'معاصرین ومتعلقات مولانا ابوالکلام آزاد' کے عنوان سے نئی آواز، دہلی سے ان کی ایک اور کتاب کی اشاعت ہوئی اس کتاب میں مولانا آزاد کا سید سلیمان ندوی، علامہ اقبال اور مولانا محمد علی جوہر سے تقابلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دسنوی صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت اور خدمات پر سب سے

زیادہ مضامین اور کتب تحریر و تصنیف کی ہیں ان کا شمار ماہر آزاد کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

'حیات ابوالکلام آزاد' پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف محقق و نقاد خلیق انجم نے لکھا ہے:

'حیات ابوالکلام آزاد' کو پانچ حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ ہر ایک مولانا کی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ ان تمام ابواب میں تقریباً 236 عنوانات قائم کر کے مولانا کی زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے بابِ اوّل میں مولانا کے خاندان، ان کی ولادت، ہندوستان میں ان کی آمد، ان کے بچپن کے اہم واقعات، شاعری اور صحافت میں ان کی دلچسپی وغیرہ جیسے واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ دوسرے باب کے آغاز میں 'الہلال' کے اجرا کی تفصیلات، پھر مولانا کی زندگی کے کچھ اہم واقعات مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی سے آزاد کے تعلقات، مسجد کانپور کا واقعہ، الہلال اور مرزا غالب، رانچی میں مولانا کی نظر بندی، قرآن کریم کی تعلیم و اشاعت، مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے عنوانات کے تحت تفصیلات بیان کی گئی ہیں، وہ ہندوستان کی تاریخ اور خاص طور سے جنگ آزادی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ یہ ضخیم کتاب مولانا آزاد کی سوانح اور جنگ آزادی کی تاریخ کا اہم ماخذ ہے۔ اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر میرا مشورہ ہے کہ دسنوی صاحب کوشش کر کے اس کتاب کو انگریزی اور ہندی میں بھی ضرور شائع کریں۔

('سرمایۂ ادب' مرتبہ محمد نعمان ص:126)

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے خط بنام عبدالقوی دسنوی میں اس کتاب سے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا ہے:

19 رجون 2000

میرے کرم فرما عبدالقوی دسنوی صاحب

امید ہے کہ آپ بخیر ہوں گے۔ آپ کی تصنیف فائقہ 'حیات ابوالکلام آزاد' موصول ہوئی۔ کتاب کیا ہے آزاد انسائیکلوپیڈیا ہے۔ دوسری سبھی کتابیں اس کے آگے فروتر ٹھہریں گی۔ دیر آید درست آید اسی کو کہتے ہیں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور ایسے بڑے علمی کاموں کے لیے آپ کو صد

وہ سال سلامت با کرامت رکھے۔

والسلام
گوپی چند نارنگ

اس کتاب کو دیکھتے ہی پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے حسب ذیل قطعہ لکھ کر اپنی رائے ظاہر کی تھی:

قطعہ

جناب دسنوی نے کیا حسیں تحفہ مجھے بھیجا
کہ جس کو دیکھ کر دل میں سرور آنکھوں میں نور آئے
''حیات ابوالکلام آزادؔ'' ہے نام اس عطیے کا
مرے پاس اس طرح آیا کہ جیسے اذن صور آئے
ہمارے اک امیر کارواں کی داستاں ہے یہ
کہ جس کو پڑھ کر اہلِ ہند کے دل میں غرور آئے
یہ سرتاج محبانِ وطن کا زندگی نامہ
کچھ ایسے آیا جیسے ہاتھ میں لے کر قشور آئے
یہ ہے روداد اک درویش سیرت عالمِ دیں کی
یہ ایسے آئی جیسے سامنے شمعِ شعور آئے
عجب تحفہ ہے جو یوں ڈاک کے انبار میں آیا
ادب کی بزم میں جس طرح سے صدر الصدور آئے

('سرمایۂ ادب' مرتبہ محمد نعمان ص:109)

مولانا ابوالکلام آزاد پر پروفیسر عبدالقوی دسنوی کا نہایت ہی جامع کام 'حیات ابوالکلام آزادؔ' ہے۔ حیات ابوالکلام آزاد قوی صاحب کا وہ کارنامہ ہے جس پر اہل اردو کو ان پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ یہ کتاب 912 صفحات پر مشتمل ہے۔ یوں تو مولانا آزاد پر لاتعداد کتابیں لکھی گئیں لیکن

مولانا آزاد جیسی ہمہ جہت شخصیت جو بیک وقت مترجم، صحافی، ادیب، شاعر، مورخ، انشاپرداز اور مجاہد آزادی تھے کے تمام پہلوؤں کو باریکی سے سمیٹنا جوئے شیر لانے کے برابر تھا اس کام کو قوی صاحب نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ یہ کتاب مولانا آزاد کی مکمل سوانح حیات ہے۔ اس میں آزاد پر لکھی جانے والی دیگر مصنفین کی کتابوں کا تعارف اور تجزیہ بھی موجود ہے ساتھ ہی مولانا آزاد کی تصانیف، ان کے جاری کردہ رسائل کے نام بھی تحریر کیے گئے ہیں۔

حیات ابوالکلام آزاد درج ذیل پانچ ابواب میں منقسم ہے۔

باب اوّل جو مولانا کی پیدائش یعنی 1888 سے لے کر 1911 تک کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس میں مولانا کے خاندان، پیدائش، بچپن، ابتدائی تعلیم، ہندوستان میں آمد، تعلیمی نصاب اور اساتذہ، لکھنے کا آغاز، شاعری، صحافت کی ابتدا وغیرہ کا احاطہ نہایت شرح وبسط کے ساتھ کیا گیا ہے۔ باب دوم کا آغاز 'الہلال' کے احوال سے ہوتا ہے۔ مصنف نے اس باب کے تحت الہلال کے آغاز، محرکات، موضوعات ومسائل اور مشمولات پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔

بعد کے تین ابواب میں جو چھوٹے بڑے واقعات بیان کیے گئے ہیں وہ ہندوستان کی تاریخ اور جنگ آزادی پر روشنی ڈالتے ہیں۔

حیات ابوالکلام سے متعلق ریاض الرحمٰن شیروانی دسنوی صاحب کے نام خط میں لکھتے ہیں:

> 1912 کو مولانا آزاد کی زندگی میں آپ نے جو اہمیت دی ہے اور اس کا ذکر جس انداز میں فرمایا ہے وہ میرے نزدیک اس کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے دل چاہتا تھا کہ 1920 اور 1940 کی اہمیت پر بھی اس انداز سے روشنی ڈالی گئی ہوتی۔ دراصل میرے نزدیک مولانا آزاد کا سیاسی کارنامہ یعنی ہندوستان میں قومیت متحدہ کا تحفظ بہت اہم ہے اور مولانا کی مسلم لیگ اور اس کے قائد اعظم سے جو آویزش ہوئی اس سے مولانا کی سیرت اور کردار کے کئی پہلو بہت تابناکی سے نمایاں ہوئے مثلاً مولانا کی استقامت، ان کا تدبر، ان کی شرافت نفسی اور ان کا تحمل۔ آپ نے ندوۃ العلما میں مولانا آزاد کی ایک عربی تقریر کا ذکر کیا ہے جس کے بعض حصّوں پر بقول آپ کے مولانا شبلی نعمانی جھوم جھوم اٹھے تھے لیکن اس کا

حوالہ نہیں دیا ہے۔ میں نے ندوۃ العلما کے اس دور کے کسی جلسہ میں جس عربی تقریر کی سب سے زیادہ تعریف وتوصیف پڑھی ہے وہ مولانا سید سلیمان ندوی کی تقریر تھی جس سے متاثر ہو کر علامہ شبلی نعمانی نے اپنی پگڑی سید صاحب کو اوڑھا دی تھی۔ حیات ابوالکلام آزاد میں علامہ شبلی کی جو مدح سرائی کی گئی ہے وہ ان کے شایاں شان ہے اور خود آپ کی حقیقت پسندی پر دال ہے۔ مجموعی طور پر یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ مولانا آزاد کی اردو ادب کی اور تحقیق وتنقید کی ایک بڑی خدمت ہے۔''

قوی صاحب اور اردو

قوی صاحب کی زندگی کا ہر لمحہ اردو کے لیے وقف تھا۔ انھوں نے تاحیات اس کی آبیاری کی اور اسے پروان چڑھایا اور اس کی ترویج واشاعت کے لیے زندگی بھر سرگرم عمل رہے۔ اردو زبان سے ایسی محبت کہ اس کے لیے اپنی پوری زندگی صرف کردی۔ ادب کی خدمت ان کی متاع حیات تھی۔

اردو سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے اردو زبان کی نوعیت خصوصیات اور مسائل سے متعلق 33 مضامین لکھے۔ ان میں 'میں اردو ہوں'، 'کچھ اردو کے بارے میں'، 'قصہ اردو کی بے بسی کا'، 'اردو پر عجب وقت پڑا ہے'، 'اردو اور نئی نسل'، 'قصہ پھر حکومت اردو اور اردو والوں کا'، 'اردو محبت کی طلبگار ہے'، 'بات اردو اور اردو رسم الخط کی'، 'شمع یہ سودائی دل سوزئ پروانہ ہے'، 'اردو کا مستقبل ہندوستان میں' یہ تمام مضامین 'ہماری زبان' (نئی دہلی) اور مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے اور پھر انھوں نے اپنے تمام مضامین کو یکجا کر کے با قاعدہ 250 صفحات کی ایک کتاب 'میں اردو ہوں' میں شائع کیا۔ جس کا مطالعہ اردو سے ان کی محبت کے گہرے جذبے کو ظاہر کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے بیشتر مضامین میں اہل اردو کو ان کی مادری زبان کی اہمیت بتانے کی کوشش کی۔ قوی صاحب کی اردو سے والہانہ محبت کا ذکر کرتے ہوئے عارف عزیز لکھتے ہیں:

''قوی صاحب کو اردو زبان سے والہانہ عشق تھا، اس کے لیے وہ ہر دم کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے، نصف صدی سے زیادہ کی ادبی زندگی کا بڑا حصہ انھوں نے اردو

زبان کی خدمت میں صرف کر دیا۔ اگر یہ دعویٰ کیا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ قوی صاحب وہ انسان تھے جو اردو پڑھتے، اردو لکھتے، اردو پہنتے اور اردو کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتے تھے، ان کی غذا، بیماری، دوا اور صحت اردو تھی، اس زبان پر مرنے اور جینے کے لیے وہ ہمہ وقت تیار رہتے، لیلائے اردو سے عشق کے سوا ان کی زندگی کا بظاہر کوئی دوسرا مقصد نہیں تھا، نہ انھیں پرورش لوح و قلم کے سوا کوئی اور کام تھا۔''

قوی صاحب کے خون میں اردو کی محبت گردش کرتی رہی اور اس کی ترقی اور بقا کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہے۔ ہر موضوع پر لکھتے وقت اردو کو ملحوظ خاطر رکھا۔ بھوپال اور غالب کی تصنیف کرتے وقت بھی انھیں اس بات کا احساس تھا شخصیت کو زندہ رکھنے کے لیے زبان کی کیا اہمیت ہے۔

اردو کی مخالفت کرنے والوں کو وہ شدت سے ناپسند کرتے تھے اور اپنی تجربہ کار اور دوررس نگاہوں سے وہ ایسے عناصر کو دور سے پہچان لیتے تھے۔ اس کا بے باک اظہار اپنے ایک مضمون 'اردو اور نئی نسل' میں وہ اس طرح کرتے ہیں۔

'' آزادی کے بعد ایک حادثہ یہ بھی ہوا ہے کہ ایک جماعت ایسی ابھر کر آئی ہے جو اردو کے ذریعہ روزی روٹی اور شہرت، انعام و اکرام تو حاصل کرتی رہتی ہے لیکن وہ اردو کی وفادار نہیں۔ اس جماعت میں اردو اساتذہ بھی ہیں۔ شعرا اور نثر نگار بھی ہیں۔ ادبی انجمنوں سے متعلق بھی ہیں اور سیاسی مفاد پرست بھی ہیں یہ اداروں میں، تعلیم گاہوں میں داخل ہو کر یا باہر رہ کر ادارے کے وقار کو اور اردو کے مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔''

دسنوی صاحب کی کتاب 'میں اردو ہوں' سے متعلق پروفیسر صغرا مہدی نے خط میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

نئی دہلی

11 مئی 2006

محترمی معظمی

تسلیم

امید ہے آپ مع متعلقین کے بخیر ہوں گے۔

نعمان صاحب نے آپ کی تازہ تصنیف 'میں اردو ہوں' دی جو میرے لیے قیمتی تحفہ ہے۔ پڑھ تو دو دن میں لی تھی، مگر اس کا شکریہ ادا کر رہی ہوں۔

اردو زبان اور ہندوستان میں اس کی صورت حال کا بہت خوب جائزہ ہے۔ یہ ایک ایسی دستاویز آپ نے تیار کر دی ہے کہ اردو زبان کی تاریخ میں اس کی خاص اہمیت ہے۔ آپ نے بہت خلوص، دردمندی سے اردو کی صورت حال کو اجاگر کیا ہے اور یہ وہی کر سکتا ہے کہ جس کو اپنی زبان سے عشق ہو اور اس کی بقا و فروغ کے لیے مضطرب ہو۔ اردو اس کے صرف روزی روٹی کا وسیلہ نہ ہو۔

بہر حال خدا آپ جیسے مخلص اور علمی کاموں سے شغف رکھنے والوں کو تندرست اور زندہ سلامت رکھے۔ ہمیں بھی کچھ کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

گھر میں سب کو سلام و دعا کہیے۔

نوٹ: کتاب کی قیمت انمول بھی ہے اور نایاب بھی۔

خاکسار

(پروفیسر صغرا مہدی)

قوی دسنوی پیغام بر اردو

پیغمبر کے لغوی معنی پیغام دینے والا ہے اسی لیے خدا کی طرف سے الہامی پیغامات قوم کو پہنچانے والا بھی پیغمبر کہا جاتا ہے۔ اگر جناب قوی دسنوی صاحب کو اردو کا پیغام پہچانے والا 'پیغام بر اردو' کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ موصوف کی تازہ تخلیق 'میں اردو ہوں' کتابی شکل میں ایک ایسی دستاویز ہے جس میں ادبا، شعرا، دانشوروں اور علما نیز چند سیاسی سماجی رہنماؤں کے اردو کے بارے میں خیالات و افکار کو قوی صاحب نے اپنے مضامین میں پرو کر اہلِ ملک کو اردو سے محبت اور رغبت کے پیغام دیے ہیں۔

'میں اردو ہوں' کے جملہ مضامین قوی دسنوی صاحب کی اردو سے محبت اور بے لوث

خدمت کا بین ثبوت ہیں۔ اردو کی تاریخ مرتب کی جائے تو یہ دستاویزی تخلیق بذات خود تاریخی حیثیت کی حامل نظر آئے گی، ہندوستان کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے رسائل اور منعقد ہونے والے سیمناروں میں قوی دسنوی صاحب نے جو لکھا اور پیش کیا وہ تمام یکجا کتابی شکل میں علما، ادبا، شعرا کے افکار، اشعار اور آرا کے ساتھ شائع کر کے اردو دستوں کو اردو سے محبت کرنے، اور لکھنے، اردو پڑھنے اور پڑھانے کا پیغام ہی نہیں دیا بلکہ ایسا درد دیا ہے جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس درد کو محسوس کرنے والا خود تڑپ سکتا ہے تڑپا نہیں سکتا، اپنے اس درد کو بانٹنے کا کام قوی دسنوی صاحب ایک عرصہ سے کرنے میں مصروف ہیں۔ کاش یہ تڑپ ہر اردو دوست کے دل میں سما جائے اور ہم اپنی غلطیوں کا ازالہ کر سکیں۔

مانا کہ اردو کوئی غیر ملکی زبان نہیں کچھ کٹر، تنگ ذہن اور سیاسی افراد نے اسے اپنے مفاد کے لیے مسلمانوں کی زبان قرار دے کر صدیوں کے بھائی چارے کو نقصان پہنچانے کی کوشش ضروری لیکن ان کوششوں کو ناکام کرنا بھی ہمارا ہی فرض تھا، لیکن ہم بے حسی کا شکار بن کر خود اپنے آپ کو نقصان پہنچا بیٹھے اور پہنچا رہے ہیں۔

قوی دسنوی صاحب نے اسی بے حسی کو دور کرنے کی ترغیب اپنے مضامین سے دلانے کی کوششیں کی ہیں۔ ہندی اخبارات میں ساٹھ فیصد اردو الفاظ استعمال ہو رہے ہیں، بلکہ فارسی الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں وہ بھی اردو کی مقبولیت کی دلیل ہیں اس لیے ہم اہلِ اردو کو اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا ہے مگر اب ضرورت ہے بیداری کی۔ اگر ہم اپنے گھروں میں اردو تعلیم کو فروغ نہیں دیں گے تو ہمارا اپنا ہی، قومی ملی اور تہذیبی نقصان ہوگا۔

عبدالقوی دسنوی کی فعال زندگی آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ قوی صاحب کی شہرت، مقبولیت ان کی مسلسل جد و جہد محنت ولگن اور اردو زبان وادب کے فروغ میں بے لوث خدمات کا نتیجہ ہے۔

وہ ہند و پاک کے معروف ادیب، معتبر ناقد اور ماہر تعلیم مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے صرف درس و تدریس اور ادیب کے فرائض انجام نہیں دیے بلکہ کئی نسلوں کی ذہنی تربیت بھی کی ہے جن سے آج کی موجودہ نسل فیضیاب ہو رہی ہے۔

مادیت پرستی کے اس دور میں قوی صاحب نے اپنی بے لوث علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات سے جو روشن مثال قائم کی ہے وہ اور ان کی فعال اور متحرک زندگی آنے والی نسلوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ عبدالقوی دسنوی کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات کے سبھی معترف ہیں۔ انھوں نے اردو تحقیق وتنقید میں نئے نئے موضوعات شامل کر کے اور تنقید میں توازن اور اعتدال پیدا کر کے دوسروں کے لیے فکر وتحقیق کی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔

امید ہے کہ آنے والی نسلیں عبدالقوی دسنوی کی شخصیت اور طویل، ہمہ گیر علمی ادبی، تعلیمی، تدریسی اور انسانی، اخلاقی خدمات سے مستفیض ہو کر اپنی زندگی کو سنوار کر زبان وادب کی خدمت میں اہم کردار ادا کریں گی۔

مصنف کی تحریروں کا جامع انتخاب

دسنہ، بمبئی اور بھوپال کے شب و روز

بمبئی سے بھوپال کا سفر

صبح ہونے جارہی تھی اس کی سفیدی کے پھیلنے میں ابھی دیر تھی، تاریکی اور اجالے کی لڑائی شروع ہوگئی تھی اور تاریکی کو پسپائی کا سامنا تھا۔ ہوا میں خنکی تھی، فضا خاموش تھی۔ اس وقت میں ایک خاص قسم کی دل میں گدگدی پیدا کرنے والی کیفیت محسوس کررہا تھا لیکن صبح نے ابھی گنگنانا شروع نہیں کیا تھا کہ اٹارسی اسٹیشن آگیا۔ اٹارسی سے تو میں بار بار بمبئی سے دسنہ اور دسنہ سے بمبئی جاتے ہوئے گزرا تھا لیکن 19 رفروری 1961 کو جب گاڑی اٹارسی کے اسٹیشن پر رکی تھی تو اس بار مجھ پر عجب مسرت اور گھبراہٹ کی کیفیت طاری تھی۔ یہ خیال دل میں ایک خاص اضطراب پیدا کررہا تھا کہ گاڑی دو گھنٹے بعد بھوپال پہنچ جائے گی۔ اٹارسی کے بعد گاڑی کو چند منٹ کے لیے ہوشنگ آباد اسٹیشن پر رکنا ہے۔ میرے لیے یہ نام سنا ہوا محسوس ہوا۔ کچھ ایسا خیال آرہا تھا کہ تاریخ کی کتاب میں شاید یہ نام پڑھا تھا۔ اس لیے اس نام کے ساتھ میرا ذہن تھوڑی دیر کے لیے تاریخ کے ساتھ جڑ گیا اور میں اس نام کے ساتھ خاص لگاوٹ محسوس کرنے لگا تھا۔

اسکول کی تعلیم کے زمانے میں بھوپال کا نام پہلی بار نواب حمیداللہ خاں کے وسیلے سے میرے سامنے آیا تھا۔ پھر علامہ سلیمان ندوی کی وجہ سے ریاست کا نام بار بار کانوں میں گونجتا رہا تھا۔ اہل دسنہ کو اپنے فرزند سید سلیمان ندوی پر بڑا فخر وناز رہا ہے۔ 1946 میں وہ بھوپال میں قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز تھے اس لیے اس کے ذکر کے ساتھ بھوپال کا نام بار بار آجاتا تھا۔ عم محترم مولوی سید نجم الہدیٰ ندوی صاحب جن کے ساتھ آرہ (بہار) میں رہ کر میں، رکن الدین میرے بڑے بھائی پروفیسر عبدالحی صاحب امین بھائی، احد بھائی، شبلی بھائی نے اسکول کی تعلیم حاصل کی ہے سید صاحب کے بچپن کے ساتھی تھے۔ وہ بھی اکثر سید صاحب کے بچپن کے دسنہ اور ندوہ کے واقعات سناتے تھے۔ اسی کے ساتھ بھوپال کا ذکر بھی آجاتا تھا۔ بمبئی میں بھوپال آنے سے قبل ایک ڈیڑھ سال تک میں نے احمد سیلر ہائی اسکول میں بشیر صاحب کی جگہ پر بحیثیت استاد کام کیا تھا۔ وہاں عربی کے استاد مولانا عباس بھوپالی تھے جو مجھے بہت عزیز رکھتے تھے۔ وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑے تھے۔ ان کی زبانی بھوپال کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ سیفیہ کالج کا نام میں نے پہلی بار انہی کی زبان سے سنا تھا وہ اس کالج کے بڑے مداح تھے۔ سیفیہ کے حوالے سے مسعود صدیقی صاحب کا ذکر بھی وہ اکثر کرتے تھے۔ مسعود صدیقی صاحب کو میں ترقی پسند ادیبوں کے رشتہ سے جانتا تھا۔ عباس صاحب کا کہنا تھا کہ سیفیہ کالج کی تعمیر سے مسعود صدیقی صاحب کی بڑی دلچسپی تھی۔ اس طرح عباس صاحب نے میرے دل میں سیفیہ کالج کے لیے ایک خاص جگہ پیدا کر دی تھی۔

یوں بھی تعلیم گاہوں سے مجھے بڑی دلچسپی رہی ہے۔ اس کی وجہ ممکن ہے یہ بھی ہو کہ میرے والد محترم پروفیسر سید سعد رضا صاحب کا تعلق ساری زندگی تعلیم گاہ سے رہا تھا۔ ان کی زبانی سینٹ زیویرس کالج کے حالات اور واقعات میرے کانوں تک بچپن ہی سے پہنچتے رہے تھے اور میرے دل میں اتر کر اپنا اثر چھوڑتے رہے تھے۔ وہاں کے پادریوں کی نیکی، خوش اخلاقی، شرافت اور انسان دوستی کے واقعات سنتا رہتا تھا اور متاثر ہوتا رہتا تھا، وہاں کے مہذب طلبا اور اپنے فرائض سے آشنا اساتذہ کے اخلاق، عادات، کردار، ذہانت اور علمی فتوحات کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا، جس کی وجہ سے اس کالج کے اساتذہ اور طلبا کو دیکھنے کا مشتاق ہوتا رہا تھا۔ خود میرے وطن دسنہ کے

مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ مولوی علی حسن صاحب اور مولوی عبدالرزاق صاحب وغیرہ کی سادگی سچائی طلبا سے شفقت، گاؤں والوں سے ہمدردی، دلچسپی اور ان کی اپنی ذمے داری کے احساس نے میرے بچپن کے شعور اور احساس کو بے حد متاثر کیا۔ اسی زمانہ میں پہلا ماہنامہ جو والد صاحب نے ہم لوگوں کے لیے جاری کرایا تھا وہ 'پیامِ تعلیم' دہلی تھا۔ موجودہ سائز سے بڑا تقریباً چالیس صفحات پر مشتمل یہ ماہنامہ بچوں کے لیے مفید اور دلچسپ تھا اس لیے گھر کے سب بچے بڑی بے چینی سے ہر ماہ اس کی آمد کا انتظار کرتے تھے۔ اس کی کہانیاں سبق آموز ہوتی تھیں اور لطیفے لطف دے جاتے تھے۔ عرصہ تک یہ رسالہ آتا رہا تھا اور میں نے اس کے تقریباً تمام شمارے احتیاط سے رکھے تھے۔ جو میری کالج کی زندگی تک محفوظ رہے تھے اسی رسالہ نے مکتبہ جامعہ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کی اہمیت اور قدر و قیمت سے آگاہ کیا تھا اور محترم ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی عظمت دل میں بٹھائی تھی۔ اسی رسالہ سے اس زمانہ کے اردو کے بعض ادیبوں اور خدمت گزاروں سے واقفیت حاصل ہوئی تھی۔ اسی رسالہ میں میرا پہلی بار نام چھپا تھا جب میں نے کسی پرندے کی تصویر میں رنگ بھر کر پہلا یا دوسرا نمبر حاصل کیا تھا۔ اس وقت میرا جامعہ ملیہ سے جو تعلق پیدا ہوا تھا وہ آج تک قائم ہے۔ اسی کے ساتھ سرسیّد تحریک کے اثرات جو اہل دسنہ کے ذہن ودماغ پر پڑتے رہے تھے مجھے بھی نہ صرف متاثر کرتے رہے بلکہ سرسید کا شیدائی بناتے رہے تھے۔

لیکن اس وقت جیسے جیسے بھوپال قریب ہوتا جارہا تھا مجھ پر ایک خاص قسم کی خوشی اور گھبراہٹ طاری تھی۔ گھبراہٹ اس لیے تھی کہ میں تن تنہا ایسے شہر کی طرف جارہا ہوں جہاں میرا کوئی نہیں تھا۔ میں اپنے بڑے بھائی پروفیسر عبدالحی صاحب سے وی ٹی اسٹیشن پر رخصت ہوکر پنجاب میل پر سوار ہوا تھا تو پہلی بار یہ احساس جاگ اٹھا کہ میں اب اکیلا ہوگیا ہوں، اب میری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے نہ مشکل وقت میں تعاون کا ہاتھ بڑھانے والا ہے۔ اب تک کی زندگی میں، میں نے کبھی اپنے آپ کو اکیلا یا بے یارومددگار نہیں محسوس کیا تھا لیکن اس وقت صرف میری ہمت تھی جو مجھے حوصلہ مند بنائے ہوئے تھی اور میں بے چینی سے بھوپال کا انتظار کررہا تھا۔

مجھے یاد آرہا تھا کہ جیسے گاڑی نے سیٹی بجائی تھی میں نے بھائی صاحب کو ہاتھ ہلاتے ہوئے ''خدا حافظ'' کہا تھا اور انھوں نے ہاتھ ہلا کر مجھے رخصت کیا تھا اور چند لمحات ہی میں میرے اور

بھائی صاحب کے درمیان گاڑی کی چھک چھک، ڈبے کا مخصوص ماحول اور سفر کا تناؤ حائل ہو گئے تھے۔ میرے اردگرد بہت سے مسافر تھے بہت ساری آوازیں گونج رہی تھیں، قہقہے بھی شور مچا رہے تھے۔ لیکن میں بالکل تنہا تھا، اجنبی تھا۔ بھائی صاحب سے علیحدگی کا احساس بہت دیر تک مجھے اپنی گرفت میں لیے رہا تھا، کچھ کچھ گھبراہٹ بھی مجھے ہراساں کیے ہوئے تھی، لیکن آہستہ آہستہ ماحول بدلا، کچھ مسافروں سے بات چیت ہوئی کچھ سے قریب ہوا تو تنہائی کا دبیز احساس جو میرے دل و دماغ پر حاوی ہو چکا تھا کمزور پڑنے لگا اور دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہونے لگا۔

یہ میری اس سفر میں پہلی کامیابی تھی کہ اس وقت میں نے اپنے پست حوصلہ کرنے والے جذبات پر قابو پالیا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے سوچنے لگا تھا کہ زندگی کا طویل سفر اگر بھوپال میں گزارنا پڑا تو اس سفر میں بھی کچھ اچھے لوگ مجھے مل جائیں گے، کچھ سے شناسائی ہو جائے گی۔ کچھ میری طرف ہمدردانہ آگے بڑھیں گے۔ کچھ معاون بن جائیں گے۔ کچھ اساتذہ مشفق و محترم نظر آئیں گے۔ کچھ اچھے طلبا بھی میسر آجائیں گے جو اپنے عزیزوں کی طرح ہو جائیں گے۔

سینٹ زیویرس کالج بمبئی

طالب علمی کی زندگی سے فراغت پانے کے بعد طلبا سے میرا پہلا مختصر واسطہ سینٹ زیویرس کالج میں پڑا تھا جب میں وہاں شعبۂ اردو میں فیلو مقرر کیا گیا تھا۔ وہاں کے امتحانات میں، میں نے تنہا نگراں کے فرائض بھی انجام دیے تھے لیکن اس کالج کے طلبا کا کیا کہنا؟ نہایت مہذب تھے۔ مجھے یاد ہے پہلی بار جب میں امتحان میں نگراں کے فرائض انجام دینے گیا تھا۔ اس وقت کلاس روم میں تقریباً ڈیڑھ سو طلبا تھے اور میں تنہا تھا۔ کالج کے ہیڈ کلرک، مجھے اکیلا دیکھ کر کچھ دیر کے لیے کاپیاں اور سوالات تقسیم کرتے وقت میری مدد کو آگئے تھے۔ مجھے بے حد گھبراہٹ تھی کہ کس طرح تین گھنٹے کٹیں گے۔ یہ خیال پریشان کیے ہوئے تھا کہ اگر امتحان میں کسی قسم کی گڑبڑی ہو گئی تو بڑی ذلت کا سامنا ہوگا۔ گھنٹہ بجا تو پہلے کاپیاں پھر سوالات تقسیم ہوئے اور ہیڈ کلرک صاحب یہ کہہ کر چلے گئے کہ اب ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ مجھے ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے بعد کسی کی مدد کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ امتحان کے کمرے میں طلبا ایسی

خاموشی کے ساتھ جوابات لکھ رہے تھے کہ نگراں کی ضرورت بھی باقی نہیں رہی تھی۔

انجمن اسلام اور احمد سیلر ہائی اسکول

بعد میں انجمن اسلام ہائی اسکول (بمبئی) اور احمد سیلر ہائی اسکول (بمبئی) میں پڑھانے کے تجربات میرے حصے میں آئے تھے۔ انجمن اسلام میں تقریباً ایک سال پڑھانے کا موقع ملا۔ اس اسکول کا شمار بمبئی کی مشہور تعلیم گاہوں میں تھا۔ یہاں سے تعلیم حاصل کر کے نہایت اچھے طلبا نکلتے رہے تھے۔ جنھوں نے ملک کی بڑی خدمت کی ہے۔ مشہور و معروف اداکار دلیپ کار کی ابتدائی تعلیم اسی درسگاہ میں ہوئی تھی۔ یہاں کے پرنسپل ضیاء الدین صاحب کا بمبئی کی محترم شخصیتوں میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی وجہ سے یہاں کا ماحول نہایت صاف ستھرا تھا۔ یہاں کی تعلیم کا معیار بھی بلند تھا۔ یہاں کے اساتذہ نمایاں صلاحیتوں اور کردار کے مالک تھے۔ اکثر اساتذہ اپنی ذمے داریوں کو انجام دینے میں کھوئے نظر آتے تھے اور اپنے آپ سے بے خبر رہتے تھے ان کی باخبری اگر تھی تو فرائض سے تھی۔

مجھے یہاں پڑھانے میں بہت لطف آتا تھا۔ اساتذہ ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ سلوک روا رکھتے تھے۔ عام طور سے طلبا صرف طالب علم محسوس ہوتے تھے۔ اس زمانے میں میری تنخواہ غالباً 145 روپے ماہانہ تھی۔ ایک دن کسی نوجوان استاد نے ہنستے ہنستے مجھ سے کہا کہ ان کی تنخواہ 140 روپے ماہانہ ہے میری پانچ روپے زیادہ کیوں ہے؟ پھر انھوں نے خود کہا مجھے شاید سید شہاب الدین دسنوی صاحب کی وجہ سے زیادہ تنخواہ مل رہی ہے۔ اس وقت مجھے ان کی یہ بات اچھی نہیں لگی تھی۔ میں ناجائز طریقہ سے کوئی چیز لینے کا قائل نہیں رہا ہوں۔ مجھے یہ بات کسی قیمت پر پسند نہیں تھی کہ کسی کی حق تلفی کی جائے پھر میں یہ کیسے پسند کر سکتا تھا کہ مجھے میرے ایک ساتھی سے تنخواہ محض اس لیے زیادہ ملے کہ اس ادارے (انجمن اسلام بمبئی) کے سکریٹری سید شہاب الدین دسنوی صاحب ہیں۔ میں غصے میں انجمن اسلام ہائی اسکول کے دفتر گیا اور ہیڈ کلرک سے دریافت کیا کہ اس کا راز کیا ہے کہ مجھے اسکول کے فلاں استاد سے زیادہ تنخواہ ملتی ہے جب کہ ان کی ملازمت کی مدت مجھ سے چند ماہ زیادہ ہے۔ ہیڈ کلرک جہاں دیدہ تھے سمجھ گئے۔

ہنستے ہوئے پوچھنے لگے کیا کسی نے اعتراض کیا ہے۔ان سے کہہ دیجیے کہ ان کی ڈگری فرسٹ کلاس کی نہیں ہے۔

بھوپال کے اس پہلے سفر کے آخری حصے میں اس طرح خیال بار بار آ کر میرے ذہن سے ٹکرا رہے تھے۔کبھی میں اپنے آپ کو بہت مضبوط محسوس کرتا تھا کبھی اجنبی شہر، اجنبی ماحول کا احساس مضمحل کر دیتا تھا۔معلوم نہیں کن لوگوں سے واسطہ رہے گا۔ان کے کیا اصول زندگی ہوں گے۔سنا تھا ریاستوں کا مزاج کچھ الگ ہوتا ہے۔وہاں کے لوگوں کے طور طریقے الگ ہوتے ہیں، نفع نقصان کی حیثیت الگ ہوتی ہیں، اچھائی برائی کا فرق الگ ہوتا ہے، نیکی بدی کے پیمانے الگ ہوتے ہیں۔

احمد سیلر ہائی اسکول کے طلبا بھی یاد آ رہے تھے، کل میں نے ان کے کلاس میں اسی طرح پڑھایا تھا جس طرح عام دنوں میں پڑھایا کرتا تھا۔میرا کل کا پورا دن بڑی آزمائش میں گزرا تھا۔کبھی جی چاہا کہ کہہ دوں کہ میرا اس اسکول کا یہ آخری دن ہے۔پھر تم کہاں؟ میں کہاں؟ دعائیں دے دوں ''خوش رہو میرے طلبا''، ''خدا حافظ'' لیکن نہیں کہہ سکا تھا۔اس اسکول کے طلبا مجھے عزیز تھے۔ان کے لیے میں نے بڑی محنت کی تھی۔ان کی زندگی میں انقلاب لانے کی کوشش کی تھی۔ان میں پڑھنے لکھنے کا ذوق پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی تھی، ان کی منزلیں آسمانوں میں دکھانے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ وہاں کے طلبا بہت فرمانبردار ہو گئے تھے، اساتذہ کی بڑی عزت کرتے تھے۔یہ سب کچھ میں نے آرہ ضلع اسکول آرہ (بہار) کے استاد جناب حبیب الرحمٰن صاحب سے سیکھا تھا انھوں نے طلبا میں پڑھنے لکھنے کا خاص جذبہ بیدار کر دیا تھا۔کلاس میں چندہ سے بہت سے رسائل آتے تھے۔جنھیں باری باری طلبا پڑھتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ طلبا کا ادبی ذوق نکھرنے لگا تھا اور ہماری اردو کی صلاحیت اچھی ہونے لگی تھی جس کی وجہ سے میں نے مضامین بھی لکھے تھے اور شاعری بھی شروع کر دی تھی۔مضامین 'باغی' اور 'ایک خواب' انگریزوں کے مظالم کے خلاف لکھے تھے۔شاعر کی حیثیت سے میں نے اپنا تخلص ''شورش'' رکھا تھا جو میرے انقلابی مزاج کی طرف اشارہ کرتا تھا اس زمانے کی چند تحریریں دسنہ کے نوجوانوں کے قلمی رسالہ ''آواز'' میں جگہ پا گئی تھیں۔

احمد سیلر ہائی اسکول میں اپنی انہی دلچسپیوں اور محنت کی وجہ سے مجھے اپنے آپ پر اور اپنے طلبا پر بڑا اعتماد پیدا ہو گیا تھا یہ اسی اعتماد کا نتیجہ تھا کہ ایک بار ایک طالب علم جب دسویں کلاس میں ایک استاد نعیم صاحب سے بدتمیزی سے پیش آیا تھا اور اتفاق سے میری نظر پڑ گئی تھی تو میں غصہ سے کانپنے لگا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں غصہ سے بے قابو ہو کر کلاس کے اندر داخل ہو گیا تھا اور اس لڑکے کو یہ کہتے ہوئے کہ اب آئندہ سے کلاس میں بیٹھنے کی کوشش نہیں کرنا کلاس سے نکال دیا تھا۔ اس نے مجھ سے کچھ بھی کہنے کی جرأت نہیں کی تھی اور اسکول سے باہر چلا گیا تھا۔ اس دن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری محنت رائیگاں گئی، میں ہار گیا۔

دوسرے دن میں اسٹاف روم میں بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا کہ اچانک دسویں کلاس میں زور سے بولنے کی آواز سنائی دی۔ ایک صاحب غصہ سے نعیم صاحب سے کہہ رہے تھے آپ نے میرے بیٹے کو کیوں مارا اور کلاس سے نکال دیا۔ نعیم صاحب بیحد گھبرا گئے تھے اور خاموش تھے یہ حالت دیکھ کر مجھ سے پھر برداشت نہیں ہوا میں ان کے قریب پہنچا اور کہا " کلاس سے نکالا میں نے ہے، آپ ان سے کیوں کہہ رہے ہیں۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔" انھوں نے وہی جملے مجھ سے کہے۔ میں نے کہا آپ نے اسکول اسے پڑھنے کے لیے بھیجا ہے، بننے کے لیے بھیجا ہے، میری ذمے داری ہے کہ میں اسے بگڑنے نہیں دوں۔ آپ کا بحثیت والد اس پر حق ہے تو میرا بحثیت استاد اس پر حق نہیں ہے؟ کیا میں اسے بگڑنے دوں؟ اور خاموش رہوں؟ میرا اتنا کہنا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ وہی شخص جو ابھی گرج رہا تھا بالکل نرم پڑ گیا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ وہ مجھ سے صرف اتنا کہہ سکا۔ " آپ سچ کہتے ہیں آپ کا بھی حق ہے اب میں کبھی شکایت نہیں کروں گا۔ اگر آپ اس کی ہڈیاں بھی توڑ دیں گے تو بھی شکایت نہیں کروں گا۔ مجھے معاف کر دیجیے آپ کا حق مجھ سے زیادہ ہے۔ آپ اس کے استاد ہیں آپ کی ذمے داریاں زیادہ ہیں آپ اس کی زندگی بنانا چاہتے ہیں ضرور بنایئے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔

میرا غصہ بھی ختم ہو گیا۔ مایوسی امید میں بدل گئی۔ یقین ہو گیا کہ سچائی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اچھا جذبہ اور نیک عمل اچھے نتائج کی ضمانت ہیں۔

کاروانِ ادب بمبئی

مجلہ سیفیہ کی کتابت وطباعت کی منزلیں مجھ پر آسان اس وجہ سے رہیں کہ طباعت کا تجربہ مجھے سینٹ زیویرس کالج کے اردو میگزین 'کاروانِ ادب' کی اشاعت کے زمانے میں ہوا تھا۔ یہ 1953 کی بات ہے۔ سینٹ زیویرس کالج کی 'بزمِ ادب' جس کے نگراں پروفیسر نظام الدین گوریکر تھے۔ 'کاروانِ ادب' کے نام سے اس کے دو شمارے شائع ہو چکے تھے جو س.م.زیدی صاحب کی ادارت میں ان ہی کی تنہا کوششوں سے منظرِ عام پر آئے تھے اور پسند کیے گئے تھے۔ زیدی صاحب کالج کے مقبول اور باصلاحیت طالب علموں میں تھے، نہایت اچھی تقریر کرتے تھے، بات چیت کا انداز بھی دلچسپ تھا۔

1953 میں کاروانِ ادب کے تیسرے شمارے کے ایڈیٹر ہمارے ایک دوست بنائے گئے تھے لیکن انھوں نے اکتوبر 1953 کے آتے آتے کاروانِ ادب کے سارے کاغذات اور مضامین گوریکر صاحب کو یہ کہتے ہوئے واپس کر دیے تھے کہ اشتہارات حاصل کر کے میگزین شائع کرنا ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس وقت گوریکر صاحب کالج کینٹین میں چائے پی رہے تھے۔ اس صورت حال کے لیے وہ بالکل تیار نہیں تھے پریشان ہو گئے۔ اتفاق سے اس وقت میں بھی کینٹین میں ایک میز پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ گوریکر صاحب کی پریشانی سمجھ گیا۔ میں نے ان کے قریب جا کر حقیقت دریافت کی۔ ان پر بڑی مایوسی کی کیفیت طاری تھی۔ میں نے ہمت کر کے ان سے کہا کہ اس سال میں 'کاروانِ ادب' نکال دوں گا' کاروانِ ادب' کے سارے کاغذات میرے حوالے کر دیں لیکن میری ایک شرط یہ ہے کہ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ اگر 'کاروانِ ادب' پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا تو لوگ خود ہی جان جائیں گے۔ گوریکر صاحب راضی ہو گئے اور مطمئن نظر آنے لگے۔

میں نے پہلی کوشش اشتہارات حاصل کرنے کے لیے کی۔ جہاں جہاں اشتہارات ملنے کی امید ہو سکتی تھی اور میں وہاں پہنچ سکتا تھا وہاں پہنچ جاتا اور بہت حد تک کامیاب ہوتا۔ اشتہارات کے حاصل کرنے میں میرے دوستوں میں جان محمد ابوبکر، حمید مرچنٹ، شیخ محمد عیسیٰ، محمد اسماعیل، داؤد بھائی، حاتم عبدالقادر، محمد آدم پٹیل اور ابراہیم فیض اللہ بھائی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں

جنھوں نے میری کافی مدد کی۔

میں نے کاروانِ ادب کے لیے تقریباً ساڑھے سات سو روپے کے اشتہارات جمع کیے تھے۔ کاروان ادب کی چھپائی میں پانچ سو روپے خرچ ہوئے تھے۔ باقی روپے میں کاروانِ ادب کی پانچ سو کاپیاں کے ساتھ گوریکر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیے تھے۔ یہ میری اردو دنیا میں بحیثیت طالب علم پہلی کامیابی تھی، جس کی وجہ سے پہلی بار میں اردو میں وسیع حلقہ میں روشناس ہوا اور جس نے مجھے طباعت، اشاعت اور اشتہارات حاصل کرنے کا تجربہ دیا۔

''کاروانِ ادب'' کے اس شمارے میں میرا پہلا اور آخری افسانہ ''نہ سنا جائے گا'' شائع ہوا تھا جو پسند کیا گیا تھا۔

اس کے بعد 1954 کے کاروانِ ادب کا میں مہتمم مدیر بنا دیا گیا اور خود گوریکر صاحب مدیر خصوصی بن گئے۔ کام میں نے سب وہی کیا جو مدیر کی حیثیت سے پہلے کیا تھا۔ اس کے بعد پھر ایک سال 57-1956 کے کاروانِ ادب کی مجلس ادارت کا رکن رہا۔

ملازمت سے سبکدوشی

میں نے 31 اکتوبر 1990 کو ملازمت سے سبکدوش ہونے سے ایک دن قبل سیفیہ کے اساتذہ طلبہ اور معززین شہر سے دعوت نامہ کے ذریعے ملاقات کی خواہش کی جس کے نتیجہ میں اس الوداعی جلسہ میں مخلصین کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ جلسے میں میں نے 'رخصت نامہ' کے ذریعے ابتدا میں اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کیا:

> ''میں آج آپ کے سامنے یہ نہیں کہنے جا رہا ہوں کہ میں نے تقریباً تیس سال اپنی زندگی کے اس کالج کو دے کر کوئی کارنامہ کیا ہے۔ اس لیے کہ مجھ جیسے بہت سے اساتذہ اس کالج یا بہت سے دوسرے کالجوں کو اپنی عمر عزیز کے تیس سال دے چکے ہیں یا دینے جا رہے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔''

میں آج آپ کو یہ بھی بتانا نہیں چاہتا کہ میں نے نہایت ایمانداری اور محنت سے اپنے منصبی فرائض انجام دیے ہیں، اس لیے کہ ہماری دانش گاہ کے بہت سے اساتذہ اس بات کے مدعی ہیں

اور وہ برحق ہیں۔

میں آج یہ بھی گوش گزار کرانا نہیں چاہتا ہوں کہ میں نے شعبۂ اردو کی تعمیر میں بڑا اہم فرض ادا کیا ہے۔ اس طرح کی بات تو دوسرے بھی اپنے اپنے شعبوں سے متعلق کر سکتے ہیں، کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے اور ممکن ہے وہ صحیح بھی ہوں۔

میں آج آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے ندامت ہے کہ اپنی زندگی کے اس قیمتی حصے میں وہ کچھ نہ کر سکا جو میں نے سوچا تھا، جو میں نے اپنی زندگی کا مقصد بنایا تھا اور جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔

جب میں سوچتا ہوں کہ میں نے کتنے مظفر حنفی جیسے طالب علم پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی تو تاسف کے سوا میرے حصے میں کچھ نہیں آتا۔

جب میں سوچتا ہوں کہ شعبۂ اردو کے کتب خانہ میں آٹھ دس ہزار مطبوعات کے بجائے چالیس پچاس ہزار کیوں نہ یکجا کر سکا تو اپنی بے بسی کا احساس مجھے غم زدہ کر دیتا ہے۔

جب میں سوچتا ہوں کہ شعبہ کی مطبوعات مجلّہ سیفیہ، نوائے سیفیہ اور کتابوں کو اور زیادہ بہتر طور سے کیوں نہیں پیش کر سکا تو اپنی کم مائیگی کا احساس مجھے شرمندہ کرتا ہے۔

جب میں سوچتا ہوں کہ میں نے اپنے عزیز سیفیہ کالج کی نیک نامی میں شعبۂ اردو کے ذریعے اور زیادہ اضافہ کیوں نہیں کیا تو میری بے مائیگی مجھے خجل کرتی نظر آتی ہے۔

جب میں سوچتا ہوں کہ اپنے کالج کے تمام ساتھی اساتذہ کو اپنا بنانے میں ناکام کیوں رہا تو میری بے ہنری میرا دامن پکڑ کر مجھ پر مسکراتی ہے اور میرا مذاق اڑاتی ہے۔

جب میں سوچتا ہوں کہ میں اپنے بہت سے ساتھیوں کے دکھ درد میں کیوں شریک نہ ہو سکا تو میری کم ہمتی مجھ پر ہنستی ہے اور کہتی ہے کہ بے غرضی کے ساتھ سچ کا ساتھ دینا آسان نہیں ہے۔

جب میں سوچتا ہوں کہ میں نے حرف حق کا اعلان بار بار کیوں نہیں کیا تو میری پست ہمتی سوالیہ نشان بن کر سامنے آتی رہی اور مجھے پست قد بناتی رہی۔

میں نے جب بھی سوچا کہ میری ناکامیوں کے اسباب کیا کیا ہیں تو میرے چاروں طرف کا ماحول مجھے خاموش رہنے پر مجبور کرتا رہا ہے اور کہتا رہا ہے:

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اور گم رہی یہ کہتے ہوئے میرے سامنے آنے کی کوشش کرتی رہی ہے کہ:

''جن لوگوں نے میری بات مان لی وہ سربلند ہیں، سرخرو ہیں اور کامیاب وکامران ہیں، آج انہی کو لوگ پسند کرتے ہیں اور انہی کا ساتھ دیتے ہیں۔ آنکھیں ہیں تو کھول کر اپنے اِردگرد دیکھو، کوئی نہیں دیکھتا کہ کون فرض انجام دیتا ہے کون نہیں، ان کا وجود ملک وقوم کے لیے زیادہ فائدہ مند ہے یا نقصان کا باعث ہے، وہ دروغ دیوزاد کے نقش قدم پر ہیں یا ملکہ صداقت زمانی کے شیدائی وفدائی''

اور گاہے گاہے اس طرح کی آوازیں بھی فضا میں گونجتی سنائی دیتی رہی ہیں:

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے
منزل انھیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

لیکن میرا ہم راز میرا ضمیر مجھے پکار پکار کر کہتا رہا ہے:

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

حالانکہ بار بار یہ آواز بھی میرے کانوں میں آتی رہی کہ آج کامیاب وہی لوگ ہیں جن کا شعار یہ ہے:

زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ بساز

اور یہ بھی سچ ہے کہ مسلسل حیران رہا ہوں میرے چاروں طرف سے عجیب عجیب آوازیں سنائی دیتی رہی ہیں اور معمولی فائدے کے لیے لوگوں کے اندر کے شخص کو توڑنے پھوڑنے کی کوشش کرتی رہی ہیں۔ میری آنکھوں نے دیکھا ہے کہ اچھے خاصے لوگ ان کے سامنے مبہوت رہ گئے ہیں، مذہب کی مضبوط دیواریں، انسانیت کی معتبر فصیلیں، شرافت کی محترم سرحدیں اور خاندان کی لائق فخر عظمتیں کسی سے بھی ان کی حفاظت نہ ہو سکی اور وہ بگڑتے چلے گئے۔ بکھرتے چلے گئے اور آوازیں ان میں سماتی چلی گئیں اور تخریبی اثرات دکھاتی چلی گئیں۔

سچ پوچھیے تو میرا دل ان آوازوں کو نہ پہلے قبول کر سکا اور نہ آج اپنی شکست خوردگی کے باوجود انھیں سننے کے لیے تیار ہے۔ میں ان آوازوں کے خلاف خاموشی سے لڑتا رہا، اپنے اندر

کے انسان کو جگاتا رہا اور اپنے آپ کو بچاتا رہا اور اپنے باہر کی ترغیبات سے دامن چھڑاتا رہا اور آج بھی اسی روش کو اختیار کیے ہوئے ہوں اور آئندہ بھی اختیار کیے رہوں گا۔ چاہے میں کتنا ہی اپنے آپ کو کمزور محسوس کروں، چاہے مجھے کتنے ہی خسارہ کا سودا کرنا پڑے، چاہے مجھے کتنی ہی مشکلات کا سامنا ہو، چاہے میرے سامنے کتنے ہی مسائل اٹھ کھڑے ہوں اس لیے کہ میرے دل میں یہ احساسات ہمیشہ بیدار رہے ہیں اور مجھے بار بار اس طرح سے سوچنے پر مجبور کرتے رہے ہیں:

میں اپنے بزرگوں کی پہچان کیوں مٹا دوں؟
میں اپنی شناخت کیوں کھو دوں؟
میں ایک استاد کے فرائض کیوں بھلا دوں؟
میں ایک اچھا ہندستانی بننے سے کیوں انکار کر دوں؟
میری یہ شناخت بے رنگ ہے، کھدری ہے اور پُرکشش نہیں ہے تو بھی مجھے عزیز ہے۔
میرے خیالات فرسودہ ہیں، فرسودہ سہی،
میرے اعتقادات منفعت بخش نہیں ہیں، نہ سہی
میری ادائیں دوسروں کے لیے پسندیدہ نہیں ہیں نہ ہوں، میرے جذبات کو تسکین پہنچاتی ہیں۔

میں ان سے منہ موڑ نہیں سکتا، ان سے رشتہ توڑ نہیں سکتا،

اس لیے کہ میں بے ضمیری کی زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ نہیں چاہتا ہوں، اس لیے کہ میں بے مقصدی کا قائل کبھی نہیں تھا، آج بھی نہیں ہوں،

یقین کریں کہ میں بار بار خدا کے حضور شکر گزار رہا ہوں کہ اس نے مجھے سیفیہ کالج کی خدمت کرنے کا موقع دیا۔ یہاں کے اساتذہ کے درمیان زندگی کا بیش قیمت حصہ گزارنے کا سلیقہ عطا کیا اور اس سرزمین تال و تلیا، کوہ و کہسار، سبزہ سبزہ زار، گل و گلزار، نمونۂ کشمیر جنت نظیر، فردوس گوش، بلائے ہوش، شہر بھوپال دارالاقبال میں زندگی کا بیش قیمت حصہ لگانے کے حالات پیدا کیے۔"

(بحوالہ: 'بمبئی سے بھوپال تک' عبدالقوی دسنوی)

میں کیوں لکھتا ہوں؟

میں کیوں لکھتا ہوں؟ اس کا جواب اس کے سوا کیا دے سکتا ہوں کہ حالات سے مجبور ہو کر جی چاہتا ہے کچھ لکھوں۔ سوال یہ ہے کہ جی کیوں چاہتا ہے کہ کچھ لکھوں؟ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ جس طرح انسان کی بچپن سے جب کہ ابھی وہ غوں غاں کرتا ہے اس کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ غوں غاں کر کے یا رو کر دوسروں سے اپنی بات کہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ بڑا ہوتا ہے اور بولنا سیکھ جاتا ہے تو زبان سے اپنی بات کہتا ہے۔ لیکن پڑھ لکھ کر صاحب قلم ہو جاتا ہے تو لکھ کر اپنی بات دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے جذبات، احساسات تجربات اور خواہشات کا اظہار کرتا ہے۔

یہ سب جانتے ہیں کہ انسان کے احساسات، جذبات اور انداز فکر اسے اپنے بارے میں، دوسروں کے بارے میں عام زندگی اور ماحول سے متعلق کبھی کچھ اور کبھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بلاشبہ انسان جس انداز فکر کا ہوتا ہے اس پر حالات اور واقعات کا ردِ عمل اسی طرح کا ہوتا ہے۔ تعمیری ذہن کا انسان ہر چیز کے متعلق تعمیری نقطۂ نظر سے سوچتا ہے اس کی دلچسپی افراد اور معاشرے کی تعمیر سے ہوتی ہے۔ وہ سماج کی برائیاں دور کرنا چاہتا ہے۔ برائیوں کے خلاف نبرد آزما ہونا چاہتا ہے۔ وطن کی تعمیر اور ترقی کے لیے کوشاں رہنا چاہتا ہے، عالم انسانیت کی بھلائی چاہتا ہے۔ اسے اپنے اردگرد کی معمولی معمولی خرابیاں بے چین کر دیتی ہیں وہ چاہتا ہے کہ برائیوں سے چاروں طرف کا ماحول پاک ہو جائے اور وہ ایک اچھے ماحول میں سانس لے۔

اسی طرح کی طبیعت اور انداز فکر، میں بھی قدرت سے لے کر آیا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ برائیاں دور ہو جائیں، ناانصافیاں ختم ہو جائیں، انسانوں کا استحصال کہیں نہ ہو۔ جور و ستم سے دنیا پاک ہو جائے، ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب سے دنیا کو نجات حاصل ہو جائے، مساوات کا دور دورہ ہو، انسانی برادری کا جذبہ جاگ اٹھے، ہمدردیاں ہر جگہ مسکراتی ملیں، چاروں طرف تعاون کے ہاتھ بڑھتے نظر آئیں۔ ہر طرف خوشحالی رقص کرتی دکھائی دے۔

میں نے اسی جذبہ سے لکھنا شروع کیا تھا جس کی ابتدا ہائی اسکول کی تعلیم کے زمانے میں

ہوئی تھی۔ میرا پہلا مضمون 'باغی' کے عنوان سے قلم بند ہوا تھا جو انگریز حکومت کے خلاف ایک قسم سے بغاوت کا اعلان تھا، جو میرے وطن دسنہ (بہار شریف) کے بچوں کے قلمی رسالہ ''آواز'' میں شامل ہوا تھا۔

بمبئی کے کالج کی تعلیم کے زمانے میں ایک شام وکٹوریہ گارڈن ٹہلنے گیا تو اس کے گیٹ پر کیا دیکھتا ہوں ایک چنا بیچنے والا مفلوک الحال رو رہا ہے، چنے کی ٹوکری الٹی ہوئی ہے اور سارے چنے سڑک پر بکھرے پڑے ہیں۔ اس منظر نے مجھے مضطرب کر دیا۔ معلوم ہوا کہ کسی پولس والے کی یہ حرکت تھی۔ گھر پہنچا تو ایک مختصر افسانہ کا خاکہ میرے ذہن میں تیار ہو چکا تھا، جس میں چنا بیچنے والے کی جگہ بیچنے والی نے لے لی تھی۔ میں نے قلم اٹھایا اور ایک افسانہ '......نہ سنا جائیگا' کے عنوان سے کاغذ پر پھیل گیا جو بعد میں شعبہ اردو سینٹ زیویرس کالج بمبئی کے اردو میگزین 'کاروانِ ادب' میں شائع ہوا۔

بلا شبہ میں جو کچھ لکھتا رہا ہوں یا لکھتا ہوں اس کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ اپنے احساسات جذبات اور خیالات دوسروں تک پہنچاؤں تاکہ سب مل کر معاشرے کو صحت مند بنانے کی کوشش کریں۔

اسی جذبے سے اخبارات، رسائل اور کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں جس کے نتیجے میں میرے خیالات ادیبوں سے متعلق، ادیبوں کی زندگی سے متعلق، ادیبوں کے رشحات قلم سے متعلق صفحہ قرطاس پر بکھرتے رہے ہیں، میں انسان دوست ادیبوں کا دوست اور قدرداں ہوں اور دل میں ان کے لیے نیک خواہشات رکھتا ہوں۔

(بحوالہ: 'بمبئی سے بھوپال تک' عبدالقوی دسنوی)

ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

جیسے ہی عقل و شعور کی آنکھیں روشن ہوئیں اور ہوش و حواس کے کان کھڑے ہوئے میں نے اپنے آپ کو صوبہ بہار کی ایک ایسی بستی میں پایا جو دو چھوٹی بستیوں اکبر پورا اور کلیان پور کے اتحاد کا نتیجہ تھی اور دسنہ کے نام سے مشہور ہوئی تھی، شاید اسی اتحاد نے بستی والوں کو ہمیشہ آپس میں اتفاق کا

شیدائی بنائے رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بستی ہمیشہ تعمیر و ترقی کی راہ پر آگے بڑھتی رہی، یہاں کی خوبصورت مسجد، مشہور کتب خانہ، غیر معروف مدرسہ اور متحرک انجمن الاصلاح اسی اتحاد کی نشانیاں تھیں، یہاں کی بڑی آبادی کے تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے عام طور سے یہاں کے لوگ صاف ستھری اور مہذب زندگی گزارنے کے عادی ہو گئے تھے۔

انجمن الاصلاح اور کتب خانہ الاصلاح میں سالانہ جلسے ہوا کرتے تھے جو یہاں کی آبادی پر ایک خاص اثر چھوڑتے تھے۔ کتب خانہ کی کتابوں سے بجی سجائی الماریوں پر اکثر نظریں جمی کی جمی رہ جاتی تھیں۔ جیرائین ندی جب جل تھل پانی سے موجزن نظر آتی تو اس کے جوش و خروش اور غرور کا عجب عالم ہوتا تھا یہ ندی پورے علاقہ کو خوف زدہ کر دیتی تھی کبھی غیظ و غضب میں آ جاتی تو وسیع علاقے میں تباہی مچا دیتی لیکن جب اس کی گود پانی سے خالی ہو جاتی اور اس کے حصے میں سوکھی ریت کے سوا کچھ نہیں رہتا تو وہ مضمحل اور شکست خوردہ نظر آتی بچے اس کے سینے پر بے خوف اچھلتے کودتے، جوان کشتیاں لڑتے یا دوسرے کھیل میں شریک ہوتے، بوڑھے تماش بین نظر آتے اور لطف اندوز ہوتے تو یہ ندی بے بسی سے پڑی اپنی معذوری پر رنجیدہ نظر آتی اور دنیا والوں کے لیے عبرت کی کہانی بن جاتی اور زبان حال سے کہتی:

دنیا ہے عجب چیز! کبھی صبح، کبھی شام

پیپل، برگد اور املی کے پرشکوہ درخت جب پہلی بار یہاں دیکھے تھے تو دل پر ایک ہیبت اور عجیب کیفیت پیدا ہوئی تھی لیکن جب ایک پرانا چھتنار تناور درخت اندر سے کھوکھلا نظر آیا تو وہ ساری کہانیاں بکھرتی محسوس ہوئیں جو پیپل، برگد اور املی کے درختوں کے متعلق سنی تھیں۔ ہم بچے سوچتے یہ برگد کیا ہے، کیا ہوتا جا رہا ہے، اپنی جوانی میں کیا اکڑتا ہوگا۔ اب بڑھاپے میں تنہا کھڑے کھڑے گھبراتا ہے۔ کبھی کبھی اس پر اُلو کی آواز آتی تھی۔ ہم لوگ اس کے قریب نہیں جاتے تھے۔ نہ جانے کیا کیا خیالات آتے تھے۔ اسی زمانے کی بات ہے ایک فقیر کے منہ سے نظیر اکبرآبادی کے یہ اشعار بہت اچھے لگتے تھے اور اپنا بڑا اثر چھوڑتے تھے۔

گر اچھی کرنی نیک عمل تم دنیا سے لے جاؤ گے
تو گھر بھی اچھا پاؤ گے اور بیٹھ کے سکھ سے کھاؤ گے

اور ایسی دولت چھوڑ کے تم جو خالی ہاتھوں جاؤ گے
کچھ بات نہیں بن آنے کی گھبراؤ گے پچھتاؤ گے

دسنہ لائبریری نے کتاب پڑھنے اور خریدنے کا شوق پیدا کیا تھا تو میں نے اسی بچپن میں سونے کے انڈے دینے والی مرغی کی کہانی زندگی میں پہلی کتاب ایک دھیلے میں خریدی تھی۔ جسے نہایت احتیاط سے کاغذ چڑھا کر محفوظ رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا کئی بار مطالعہ کیا تھا اور ہر بار اس احمق پر ہنسی آئی تھی جس نے سارے انڈے ایک دن میں حاصل کرنے کے لالچ میں اس کا پیٹ پھاڑ دیا تھا اور آنے والی دولت سے محروم ہو گیا تھا۔

1934 کے زلزلے کی خوفناک گھن گھن کی آواز بھی کان میں گونجتی محسوس ہوتی ہے اور خوف پیدا کر دیتی ہے گرتی ہوئی عمارتوں کی مہیب آوازیں آج بھی مجھے انسانی بے بسی کی کہانیاں سناتی ہیں اور مضطرب کر دیتی ہیں لیکن اسی کے ساتھ دسنہ کے لہلہاتے کھیت، لہراتی ہوائیں، جھومتے درخت، پھول کھلاتی شاخیں، چڑیوں کی چہکار، مٹی کی بھینی بھینی خوشبو سب کی یادیں تڑپاتی رہتی ہیں۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ اس بستی کے رہنے والوں کی آپس میں محبت، ایک دوسر کے لیے احترام، ایک دوسرے کو آگے بڑھانے کی کوششیں ایک دوسرے کے ساتھ ہر معاملے میں تعاون، ایک دوسرے کی کامیابی کو اپنی کامیابی سمجھنے کا جذبہ ایک دوسرے کی خوشیوں کو اپنی خوشی جاننے کا تصور ایک دوسرے کے غم، دکھ، درد کو اپنا درد محسوس کرنے کا انداز اور ایک دوسرے کے لیے مٹ جانے کی تڑپ آج بھی میرے دل میں ایک عجیب اضطراب پیدا کر دیتی ہے اور اس انسان پرور فضا میں لوٹ جانے کی خواہش کو جھنجھوڑ دیتی ہے۔ بار بار آج سوچتا ہوں کہ دسنہ کے وہ لوگ کتنے اچھے تھے جو دوسروں کی پرمسرت زندگی میں اپنی زندگی کی تسکین کا سامان پاتے تھے اور کتنے برے اور انسانیت کے نام پر داغ ہیں وہ لوگ جو اپنی پستی فکر کا زہر دوسروں کی پرسکون زندگی میں گھول کر اس کا سکون اور طمانیت چھین لیتے ہیں اور اپنی اس تخریبی صلاحیت پر نازاں رہتے ہیں۔

اس بستی میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کو پہلی اور آخری بار محو گفتگو دیکھا ڈاکٹر سید محمود کو اپنے گھر میں تقریر کرتے سنا۔ مولانا مسعود عالم ندوی کو آتے جاتے دیکھا، مولانا مناظر حسین

گیلانی کو گاؤں کی زبان میں سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بات کرتے سنا تو بے خود ہو گیا۔ یہیں ہر موسم گرما میں مولانا سید سلیمان ندوی کو دیکھتا رہتا تھا۔ ان کی مختلف مصروفیات نگاہوں میں آتی رہتی تھیں۔ برسوں مولوی عبدالحلیم رحمانی اور داروغہ بشیر الحق دسنوی کو کتب خانہ الاصلاح کو سجانے سنوارنے میں ڈوبا ہوا پایا۔ پروفیسر سعید رضا کو دسنہ کی تعمیر میں مصروف دیکھا۔ ڈاکٹر احمد کریم کے دل میں دسنہ کے لیے محبت مچلتی ہوئی محسوس کی۔ مولوی عبدالحفیظ ندوی کو دسنہ لائبریری کے لیے فکر مند پایا، مولانا صباح الدین، عبدالرحمٰن کی جوانی میں علمی سنجیدگی کی جھلک پائی۔ سید شہاب الدین دسنوی کے عہد شباب میں ایک عجیب وقار محسوس کیا۔ پروفیسر منظر الحق کی گفتگو میں طنز و مزاح کی ایک خاص لذت ملی جوان کی تحریر خاص طور سے 'ان کی خفگی' میں بار بار ظاہر ہوتی رہی، سعید الحق عاشق صاحب کی مسلسل ذہانت سے بھرپور گفتگو نے ہم جیسوں کو ہمیشہ حیرت زدہ بنائے رکھا۔ بات چیت میں جب انگریزی اخبارات کے زبانی اقتباسات پیش کرتے تو اہل دسنہ اپنے اس فرزند پر فخر کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ نو جوان طلبا میں اپنی بستی کو آگے بڑھانے کی تڑپ ہمیشہ دکھائی دیتی۔ میں اس بستی، اس کے ماحول اور اس کے رہنے والوں کے انداز فکر سے بے حد متاثر رہا، متاثر ہوتا چلا گیا۔ سچ ہے میں کبھی اس ماحول سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکا۔

اس بستی کے رہنے والوں کے آپسی تعلقات اور گاؤں سے دلچسپی کی کہانی نہایت جذباتی، پر خلوص اور انوکھی رہی ہے۔ اس نے مجھ جیسے نہ جانے کتنوں کی ذہنی تعمیر کی، فکر کی بلندی سے آگاہ کیا خالق و مخلوق کے رشتے بتائے، لامحدود کائنات کی وسعتوں کو سمجھایا، خود آگاہی اور خدا شناسی سے باخبر کیا۔ مخلوق خداوند کا احترام سکھایا۔ ان کے لیے کچھ کرنے کی تڑپ پیدا کی، ان کے غم میں پگھلنے اور مضطرب ہو جانے کا جذبہ بیدار کیا اور ان کی خوشی میں جھوم اٹھنے کی لذت سے آشنا کیا۔

دو سال تک کھڑ کپور (مغربی بنگال) کے قیام اور تعلیم نے بنگالیوں کی سادگی سے آگاہ کیا۔ ان کی زبان کی شیرینی سے لذت یاب ہونے کا موقع دیا۔ ان کے تعلیم حاصل کرنے کے شوق سے متاثر کیا، ان کی فطرت سے دلچسپی اور چمن سجانے کے لگاؤ نے میرے ذوق و شوق کو نکھارا، اچھی طرح یاد ہے وہاں کے ریلوے ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کوئی چکرورتی تھے نہایت پر وقار، خوبصورت داڑھی نے ان کی شخصیت میں ایک خاص شان پیدا کر دی تھی۔ سنجیدہ لیکن نہایت

بیدار مغز تھے، اسکول کے وفادار، طلبا کے لیے مشفق محترم، طلبا اور اساتذہ سے بڑی دلچسپی رکھنے والے، اچھے طلبا سے باخبر اور اچھے اساتذہ کے قدرداں تھے، اس اسکول کے اساتذہ اکثر یاد آئے ہیں، بڑے ہمدرد، محنتی، طلبا میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے فکر مند نظر آتے، بڑی دلچسپی سے پڑھاتے، چندر موہن صاحب کی صورت تو اکثر نگاہوں کے سامنے جھلملانے لگتی ہے، بڑی اچھی طبیعت کے مالک تھے۔ ہمارے دل میں ان کی بڑی عزت تھی ہر وقت پڑھانے میں مستعد رہتے تھے۔

آرہ ضلع اسکول میں میری تعلیم تقریباً چار سال ہوئی، اس کی عمارت کسی راجہ کی بنوائی ہوئی تھی، جو وطن کی آزادی کا متوالا تھا۔ اس کے کئی قصے مشہور تھے جن کو سن کر وطن کی آزادی کے لیے جوش پیدا ہو جاتا تھا۔ میں نے اس اسکول کی آٹھویں جماعت میں داخلہ لیا تھا اور ہائی اسکول کے امتحان میں یہیں کامیابی حاصل کی تھی۔ جب اس اسکول میں داخلہ لیا تھا تو اس کے ہیڈ ماسٹر کوئی سلطان صاحب تھے، انگلینڈ میں تعلیم پائی تھی نہایت باوقار ذمے دار اور فرض شناس تھے، شہر میں ان کی بڑی عزت تھی اسکول کے اساتذہ اور طلبا پر ان کا بڑا اثر تھا جس کا یہ نتیجہ تھا کہ طلبا میں بڑا نظم وضبط قائم تھا اور تعلیم کا معیار بھی اچھا تھا۔

اس زمانہ میں گورنمنٹ اسکولوں کا ایک خاص مزاج ہوتا تھا اس کے طلبا کی ایک خاص پہچان ہوتی تھی اس لیے ان میں آسانی سے داخلہ نہیں ملتا تھا، آج کی طرح نہیں کہ عام طور سے والدین اپنے بچوں کا داخلہ گورنمنٹ اسکولوں میں کرانا پسند نہیں کرتے ہیں۔

آرہ ضلع اسکول میں مجھے اردو سے بڑی رغبت پیدا ہو گئی تھی۔ مولوی نجم الہدیٰ ندوی ہیڈ مولوی تھے، نہایت ہمدرد تھے لیکن بارعب شخصیت ہونے کی وجہ سے عام طور سے طلبا ان کے پاس جانے سے گھبراتے تھے مولوی حبیب الرحمٰن طلبا میں گھل مل گئے تھے۔ وہ طلبا میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کرنے کے لیے ان میں مقابلے کا جذبہ بیدار کرنے میں لگے رہتے تھے۔ طلبا میں ہفتہ وار تقریری مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔ مضامین بھی لکھوائے جاتے تھے طلبا سے کلاس میں اردو رسائل کی ایک لائبریری بھی قائم کرائی تھی جس میں دس بارہ رسائل طلبا سے چندہ سے آتے تھے اس زمانے میں ہم طلبا میں اردو رسائل کے مطالعے کا ایک خاص شوق پیدا ہو گیا تھا۔ دسنہ کے ماحول نے میری

ذہنی اور فکری تربیت کی تھی اور مولوی حبیب الرحمٰن صاحب نے طلبا میں پڑھنے لکھنے اور مقابلہ آرائی کا ایک خاص شوق پیدا کرنے کی کوشش کی تھی جس نے مجھے بے حد فائدہ پہنچایا تھا۔

1942 کی ہندوستان چھوڑو تحریک نے انگریزوں کے مظالم اور تباہ کاریوں کو آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا جس نے انگریزوں سے نفرت پیدا کردی، چنانچہ سیاسی مضامین لکھے۔ جن میں 'باغی' اور ایک خواب، مجھے بے حد پسند تھے اسی زمانے میں ڈائری لکھنے کا بھی شوق پیدا ہوا تھا، میں اور میرے دوست رکن الدین نے شاعری بھی شروع کی تھی رکن الدین کا تخلص' یکتا' تھا اور میرا 'شورش' تھا یہ میرے انقلابی ذہن کا ترجمان تھا میں نے کئی باغیانہ پرجوش نظمیں لکھی تھیں، اس زمانہ میں جوش ملیح آبادی بھی میرے پسندیدہ شاعر بن گئے تھے، اختر شیرانی سے بھی متاثر ہو کر کچھ نظمیں کہی تھیں۔

بمبئی میں تعلیم کا زمانہ اس لیے اہم ہے کہ والد محترم پروفیسر سعید رضا صاحب کی نگرانی میں رہنا پڑا اور انہی کے مشہور سینٹ زیویرس کالج میں میری تعلیم ہوئی۔

والد صاحب کی زندگی نہایت سادہ تھی یا اس وقت تک سادہ ہوگئی تھی شیروانی قمیص، پاجامہ، ترکی ٹوپی یہ ان کا لباس تھا، اسی لباس میں وہ ہمیشہ کالج جایا آیا کرتے تھے۔ وہ عربی. فارسی اور اردو کے استاد اور صدر شعبہ تھے عربی نہایت اچھی جانتے تھے۔ ان کی فارسی دانی کے ایرانی معترف تھے۔ اردو میں خاص طور سے اقبال اور غالب کے کلام پر اچھی نگاہ تھی۔ نام و نمود سے بے نیاز ہنگاموں سے دور رہنا ان کا مزاج تھا، شاعر بھی تھے اردو فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن کبھی کبھار، اسے ذریعۂ شہرت نہیں بنایا، فرض منصبی کی ادائیگی میں بے مثال تھے دولت کی ہوس نہ تھی نمائش اور شان و شوکت پسند نہیں کرتے تھے، اپنی سادگی میں خوش تھے۔ روزانہ ٹھیک وقت پر تیار ہو کر کالج جاتے اور تعلیمی ذمے واریوں سے فراغت پا کر گھر لوٹ آتے۔ گھر پر بھی زیادہ وقت مطالعے اور دوسرے دن کی تیاریوں میں صرف کرتے۔ شام کے وقت ٹہلنے کے لیے ضرور نکلتے تھے، یہی ان کی زندگی تھی، وہ کبھی چھٹی نہیں لیتے تھے اور کالج جا کر نہ پڑھانا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ان کے ایک شاگرد نے کراچی یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر آنے کی دعوت دی، پروفیسر رضا نے انکار کردیا۔ سینٹ زیویرس کالج چھوڑنے کے لیے وہ تیار نہیں ہوئے۔ وفاداری بشرط

استواری کے وہ پیرو تھے۔

آج آزاد ہندوستان میں اداروں سے وفاداری کے معنی بدل گئے ہیں۔ ماضی میں جو فرائض منصبی پر پورا نہیں اترتا تھا وہ وفادار شمار نہیں کیا جاتا تھا لیکن آج ایسے وفاداروں کی کوئی قیمت نہیں ہے کوئی یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتا کیا جھوٹ ہے کیا سچ ہے۔ کون ایماندار ہے کون ایماندار نہیں ہے، کون حق ہے کون ناحق ہے، کون باصلاحیت ہے کون بےصلاحیت ہے آج اصلی نقلی سے زیادہ اپنے مفاد کو دیکھا جاتا ہے۔ اچھائی اور برائی کی، مفاد ہی کسوٹی ہے جو اس پر پورا اترتا ہے وہی صحیح ہے۔

بات پروفیسر رضا کی کر رہا تھا سلسلہ کچھ اور چھڑ گیا والد صاحب کو اپنی زندگی کے ہر موڑ پر ذمےداریوں کا احساس تھا، 1953 کے نومبر میں وہ سخت علیل ہو گئے تھے ڈاکٹر نے سختی کے ساتھ بستر پر آرام کرنے کے لیے کہا چنانچہ پرنسپل سینٹ زیوریرس کالج کو میڈیکل سرٹیفکیٹ کے ساتھ چھٹی کی درخواست بھیجی گئی، شام کے وقت دیکھتا کیا ہوں کوئی دروازہ پر دستک دے رہا ہے دروازہ کھولا گیا تو پرنسپل فادر بالا گیر سامنے کھڑے تھے اندر آئے۔ پروفیسر رضا کے بستر پر بیٹھ گئے، حال دریافت کیا، تسلی تشفی دی مجھے اور میرے بڑے بھائی پروفیسر عبدالحی رضا کو ٹھیک سے دیکھ ریکھ کی تاکید کی، رخصت ہوتے وقت میڈیکل سرٹیفکیٹ واپس کرتے ہوئے فادر بالا گیر نے کہا اس کی کیا ضرورت تھی؟ آپ نے لکھ دیا بیمار ہیں کافی ہے، جب تک آرام کی ضرورت ہے آرام کیجیے آئندہ کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں آپ کی تحریر میرے لیے سب سے بڑی سرٹیفکیٹ ہے۔ دل نے کہا اللہ اکبر اعتبار اور اعتماد کی یہ بلندی، ہم میں اکثر ہندستانیوں کو کیا ہو گیا ہے۔ عام طور سے ہم نہ صرف کسی پر اعتبار نہیں کرتے ہیں بلکہ ہر شخص کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہر شخص کے متعلق دوسروں کی کہی ہوئی جھوٹی باتوں پر شاید اس لیے یقین کر لیتے ہیں کہ خود ہی ان برائیوں میں گرفتار رہتے ہیں، ورنہ جب تک ثبوت فراہم نہ ہو اور اس کی تصدیق نہ ہو جائے کسی غلط بات پر یقین کرنا کیا معنی ہے؟"

فادر بالا گیر نے والد صاحب سے کہا آپ نے کالج کی جس دلچسپی کے ساتھ خدمت کی ہے۔ کالج کو بھی اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔ پھر انھوں نے ہم لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

پروفیسر رضا کی تنخواہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو مل کر جایا کرے گی۔ فادر بالا گیر کی یہ بات پتھر کی لکیر تھی۔ واقعی وہ فرشتہ صورت، فرشتہ خصلت تھے، علم و عرفان کے بحر بیکراں تھے، شفقت اور مہربانی کے برستے آسمان تھے، وہ ادارے کس قدر خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو ایسے پڑھے لکھے باصلاحیت صاحب کردار پرنسپل مل جائیں۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجیے: پروفیسر سعید رضا نومبر 1953 میں بیمار ہوئے تھے مارچ 1954 میں اس لائق ہوگئے کہ کچھ چل پھر سکتے تھے۔ انھوں نے پرنسپل فادر بالا گیر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ فادر بالا گیر نے وقت دیا۔ وقت مقررہ پر پروفیسر رضا ہم لوگوں کے ساتھ کالج پہنچے۔ فادر بالا گیر نے نہایت محبت سے خوش آمدید کہا، اپنے پاس بٹھایا، حال دریافت کیا۔ بیماری سے متعلق سوالات کیے پھر کالج آنے کی وجہ دریافت کی تو پروفیسر رضا نے ان کی کرم فرمائیوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ملازمت سے سبکدوش ہونے کی خواہش ظاہر کی، فادر بالا گیر حیرت زدہ رہ گئے۔ پروفیسر رضا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جب تک ڈاکٹر آرام کے لیے کہے وہ آرام کریں۔ سال بھر نہ آئیں کالج ان کی خوشی سے تنخواہ دیتا رہے گا۔ والد صاحب جواب میں شکر گزاری کا اظہار کرتے رہے اور کہتے رہے۔ میری طبیعت گھر بیٹھ کر تنخواہ لینے کے لیے راضی نہیں ہوتی، اتنے مہینے بہت ہوگئے اب مزید کے لیے دل تیار نہیں ہوتا۔ دیر تک فادر بالا گیر نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن پروفیسر رضا نے اس سلسلے میں ایک نہ سنی اور آخر جیت انھیں کی ہوئی وہ اپنی کامیابی پر خوش خوش گھر لوٹے۔ آج والد صاحب کی جب یاد بیقرار کرتی ہے تو دل سے بے اختیار نکلتا ہے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

کالج کے اساتذہ اور طلبہ نے پروفیسر رضا کی بتیس سالہ خدمات پر ان کے نام سے 'پروفیسر رضا اسکالرشپ' قائم کی جو سینٹ زیویرس کالج میں داخلے لینے والے ہائر سکنڈری میں کامیاب اس طالب علم کو ہر سال دی جاتی ہے جس کا نمبر سب سے زیادہ ہوتا ہے اور اس کالج میں یہ نمایاں خوبی محسوس ہوئی کہ اس کے پرنسپل اساتذہ اور طلبا اچھے اساتذہ اور طلبا کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ورنہ ان آنکھوں نے دیکھا ہے کہ اچھا برا، بے کردار، باکردار، فرض شناس غیر ذمے دار، سچا، جھوٹا،

آج کچھ نہیں ہوتا۔ استادی یہ ہے کہ پڑھانے کے علاوہ وہ سب کام کیے جائیں جن سے ذاتی فائدے کی امید ہو۔ ذاتی فائدے کے لیے کسی کو کسی حد تک نقصان پہنچ جائے کوئی حرج نہیں ہے۔ آج کی ہوشمندی کی زندگی یہی ہے۔

اس لیے آج تعلیم گاہوں میں گندی سیاست، غیر علمی مباحث، غیر معیاری گفتگوئیں، تہمت طرازیاں، سازشیں، جھوٹے قصے گڑھنے کے واقعات عام ہیں۔ حقائق کچھ اور ہوتے ہیں مشہور کچھ اور کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے اچھے اساتذہ اپنی ایمانداری اور محنت کے باوجود ناقدری کے شکار دکھائی دیتے ہیں اور داؤں پیچ والے کیا کیا بن جاتے ہیں لیکن سینٹ زیویرس کالج کے ماحول میں ایسی چیزیں محسوس نہیں ہوئیں۔

کالج کی دنیا سے ہٹ کر خود بمبئی شہر اپنا ایک خاص ماحول اور مزاج رکھتا ہے اور ایک باعمل زندگی کا تقاضہ کرتا ہے، بڑی بڑی عمارتوں سے ڈھکا اور چوڑی ولمبی ڈامری کی سڑکوں میں لپٹا یہ شہر لاکھوں انسانوں کے درد کی دوا ہے۔ حاجت روا ہے، زندگی گزارنے کا شعور سکھاتا ہے، خوشیوں کی دولت سے مالا مال کرتا ہے، کامیابیوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ یہاں کی سڑکیں رات کو بجلی کے قمقموں سے منور رہتی ہیں تو دن کو انسانی سیلاب سے موجزن نظر آتی ہیں جن پر ہر مذہب وملت کے لوگ اتحاد واتفاق کا نمونہ دکھائی دیتے ہیں۔ دولت یہاں ہر جگہ بکھری پڑی ملتی ہے، گلی کوچوں میں سمندر کے اندر پانی سے باہر ریت پر دولت ہی دولت ملتی ہے۔ کہانیاں بھی جگہ جگہ سنائی دیتی ہیں۔ زندگی کی بوقلمونیوں کی کہانیاں دولت دیکھنے کے لیے نظر چاہیے کہانی سننے کے لیے گوش برآواز ہونا چاہیے۔

اس عظیم الشان شہر نے مجھے زندہ رہنے کا سلیقہ سکھایا، زندگی کے نظم وضبط سے باخبر کیا، کشمکش حیات سے دوچار کیا، جہد مسلسل سے لطف اندوز کیا۔ جیؤ اور جینے دو کا سبق پڑھایا، انسانی ہمدردیوں کے نظارے دکھائے، غریبوں کا ہمدرد بنایا، دولت مندوں کی ذمے داریوں سے باخبر کیا اور ان کی بے راہ رویوں سے خوف زدہ کیا۔

میں نے اس شہر غریب نواز اور عروس البلاد میں کتنے ہی خواب دیکھے، کتنی ہی زندگیوں سے قریب آیا، کتنے ہی ہاتھوں نے مجھے سہارا دیا۔ کتنوں نے مجھے دردمندی عطا کی۔ ان کی حیثیت

اگر چہ اوراق پارینہ کی ہے لیکن زندگی کے یہ قیمتی اوراق میرے خیالات میں بار بار کھلتے اور بکھرتے رہتے ہیں اور کتنی ہی صورتوں کو میرے سامنے لاکر ان کی یادوں کو تازہ کر دیتے ہیں۔ان میں وہ صورتیں بھی ہیں جن سے میں متاثر ہوا ہوں اور جن کی زندگیوں سے روشنی اور گرمی حاصل کی ہے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی، سید شہاب الدین دسنوی، شہاب بالیر کوٹلوی، کیفی اعظمی، سردار جعفری، ظ۔ انصاری، باقر مہدی، پروفیسر ظہری الدین مدنی، پروفیسر عالی جعفری، پروفیسر نظام الدین گوریکر، پروفیسر عبدالحی رضا، اعجاز صدیقی، عمران مسافر، شاہد علی خاں کے نام میرے ذہن پر ہمیشہ چھائے رہے ہیں۔

بمبئی کے ساتھیوں اور دوستوں میں جن کے ہنستے مسکراتے چہرے میرے دل ودماغ پر ہمیشہ عجیب کیفیت پیدا کرتے رہے ہیں اور جو بار بار مجھے تخیل کے پروں پر بٹھا کر بمبئی پہنچاتے رہے ہیں ان میں سید محمد زیدی، محمد عیسیٰ، محمد صدیق بلگی، سلیمان ظفر، مجاہد حسین حسینی، محمد قاسم دلوی، سید محمد اکبر رضوی، اصغر مہدی واسطی، آدم شیخ، حامد اللہ ندوی، عبدالستار دلوی، ابراہیم رنگلا، ساگر سرحدی، ظفر گورکھپوری، فاروق شجاع، حمید صورتی، بھیم سین، اختر رومانی، اصغر رومانی، حمید مرچنٹ، حمید اختر آفندی، ماہر اکیانی، عظیم الرحمٰن صدیقی وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

میں بمبئی سے بے شمار قیمتی یادوں اور زندگی بخش تجربوں کے ساتھ 19 رفروری 1961 کو بھوپال پہنچا۔ بھوپال دو تالابوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ایک چھوٹا شہر، ماضی میں ایک چھوٹی ریاست کا دارالسلطنت اور اب ایک بڑے صوبہ کا دارالحکومت اور ایک اہم شہر ہے، بمبئی کی متحرک رواں دواں اور مصروف زندگی کو نہ پاکر اچانک محسوس ہوا کہ چلتے چلتے رک سا گیا ہوں، بلکہ ان نیلگوں آسمان کی وسعتوں سے جیسے کوئی پرندہ کسی آنگن میں اتر آئے اور تنگ ماحول میں گھٹن محسوس کرے، اس طویل عرصہ میں مجھے اکثر یہاں کی زندگی میں گھٹن اور گھبراہٹ کا احساس ہوا، کبھی ٹھٹھک گیا، کبھی ہراساں ہوگیا، کبھی مضمحل نظر آیا، کبھی مایوسی کا شکار ہوا لیکن اپنی نہ ہارنے والی فطرت کی وجہ سے ان سے بچتا بچاتا گزرتا چلا گیا اس لیے کہ یہاں سب کچھ یہی نہیں تھا بہت کچھ اور بھی تھا۔ محبتیں بھی ملیں، ہمدردیاں بھی حصے میں آئیں، لطف وکرم کی بارشیں بھی ہوئیں تعاون کا ہاتھ بھی بڑھا، ہمت افزائیاں بھی ہوتی رہیں پرخلوص آوازیں بھی کانوں میں گونجتی رہیں اور چشم تر

ہو جانے کے مناظر سے بھی گزرا، قہقہہ زار محفلیں بھی میرے حصے میں آئیں روح پرور لمحات سے بھی دوچار ہوا۔ ایمان و یقین کے جلوہ ہائے رنگا رنگ سے آنکھیں خیرہ بھی ہوئیں۔ قلب و نظر کو ٹھنڈک بھی حاصل ہوئی۔

تاج المساجد کی تعمیر نے کتنی ہی حقیقتیں بے نقاب کردیں اور مولانا محمد عمران خاں صاحب مرحوم کی مومنانہ شان، جدوجہد اور یقین کامل نے کتنے مشکلات سے گزر جانے کا حوصلہ دیا اور دل میں ایمان و یقین کے کتنے ہی چراغ روشن کیے۔

اس زمانے میں جب میں یہاں آیا سیفیہ کالج ایک چھوٹی سی عمارت کا نام تھا۔ حاضری رجسٹر پر میں بارھویں نمبر پر تھا اس وقت آرٹس سائنس اور کامرس کی ڈگری کے درجات شروع ہوئے تھے۔ سائنس کے کچھ اساتذہ دوسری جگہوں سے آئے تھے نہایت محنتی اور اچھے احساس و جذبات کے حامل تھے اور تن من سے کالج کی تعلیم اور ترقی میں مصروف ہو گئے تھے۔ آرٹس اور کامرس کے اساتذہ بھی نہایت ذمے داری سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ تمام اساتذہ میں اتحاد و اتفاق کا مضبوط رشتہ پر مسرت زندگی سے لطف اندوز کر رہا تھا۔ دیر تک محفلیں جمتی تھیں۔ ہم لوگوں کی دنیا کالج تک محدود تھی جو اگر چہ بہت مختصر تھی، سمٹی سمٹائی تھی لیکن اس میں خوشیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اساتذہ اور پرنسپل کی فہرست سے باہر دو اہم شخصیتیں بانی سیفیہ ملا سجاد حسین اور ناظم سیفیہ ملا فخر الدین صاحب کی تھیں بانی سیفیہ بظاہر اساتذہ سے دور دور کالج کی عمارت کی تعمیر میں مصروف نظر آتے تھے لیکن سچ تو یہ ہے کہ وہ کبھی ہم سے دور نہیں رہے وقت کا بڑا حصہ وہ کالج میں صرف کرتے اور ہمہ وقت وہ اس کی تعمیر و ترقی کی فکر میں ڈوبے رہتے تھے۔ ان کے خیالات میں بڑی پاکیزگی ہوتی۔ گفتگو میں ان کے دل کی سچائی اور سادگی جھلکتی، عملی زندگی میں وہ عزائم کے پہاڑ تھے لیکن بظاہر وہ محترم اور شفیق بزرگ کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتے تھے۔ ممکن ہے عام آنکھیں انھیں پہچان نہیں سکتی ہوں، عام انسان ان کو سمجھ نہ سکتے ہوں لیکن یہ سچ ہے کہ ان کے اندر بڑا عظیم انسان تھا۔ ان کی چمکتی ہوئی آنکھیں ان کے اندر کی نیکی اور شرافت ہمدردی اور دردمندی کی تصویریں پیش کرتی تھیں تعریف و ستائش سے بے نیازی اور لایعنی باتوں سے بے تعلقی بھی ان کی ایک پہچان تھی۔ وہ چھوٹے ذہن کے لوگوں کو جو ذاتی مفاد کے لیے دوسروں

کی برائی شکوہ شکایت کرتے اور سازشوں کا جال بنتے ہیں اپنے قریب نہیں آنے دیتے تھے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ متعلقین کالج کے قریب نہ رہنے کے باوجود سب کے متعلق اپنی رائے رکھتے تھے۔ٹھوس رائے، سنی سنائی باتیں ان کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ کمزور انسان کی خودغرضیاں اس سے کیا کیا نہیں کراتی، بے گناہوں کو گنہگار ٹھہراتی ہیں، اچھوں کو برا ثابت کراتی ہیں۔ بانی سیفیہ انسانی نفسیات کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی پوری زندگی محنت و مشقت میں اور ایمانداری، سچائی اور انسانیت کے احترام میں گزری تھی اس لیے وہ ایسے لوگوں کو اس لائق بھی نہیں سمجھتے تھے جن سے بات چیت بھی کی جائے۔انھوں نے اپنے لیے ابتدائی زندگی میں جو راستہ متعین کیا تھا اس پر ہمیشہ چلتے رہے۔

انھیں مدھیہ پردیش کا سرسید کہا گیا ہے۔ یہ ان کی بڑی تعریف نہیں ہے وہ اس سے سوا تھے۔سرسید کے خود اپنے حالات نے وقت کی کروٹوں کو سمجھنے اور زمانہ کے انقلاب کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت عطا کی تھی۔ ملا سجاد حسین کے حالات ویسے نہیں تھے صرف ان کی نیکی کے جذبے نے ان کو تعلیم کے میدان میں کچھ کرنے کے لیے اتارا۔ان کے احساسات نے ان کی ہمت افزائی کی اور ذہن نے رہنمائی کی۔ وہ تعلیم کا چراغ ہاتھوں میں لیے بے نور دل و دماغ تک تعلیم کی روشنی پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔ نیک جذبے اور صالح فکر کے علاوہ انھیں وہ ذرائع اور وسائل میسر نہ تھے جو سرسید کے ہر قدم پر معاون بنے ہوئے تھے۔ ملا سجاد حسین نے ناموافق حالات کا مقابلہ کیا۔محنت اور دیانتداری سے پہلے اپنی تعمیر کی پھر قوم کی تعمیر کی راہ تعلیم کے ذریعے نکالی اور تن تنہا اس راستے پر چل نکلے اپنی قوت اور صلاحیت پر انھیں اعتماد تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے بھروسے سے سب کچھ کیا اور کامیاب ہوئے۔ کسی اور کو یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ اس کا لہو بھی اس تعمیر میں شامل ہے۔سرسیّد کی طرف سارے ہندوستان نے تعاون کے ہاتھ بڑھائے۔ ایک انقلاب نے پورے ہندوستان کو سرسیّد دیا ایک انقلاب نے بھوپال کو ملاّ سجاد حسین سے نوازا۔ یہاں دونوں کا مقابلہ مقصود نہیں ہے سرسید کی عظمت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ ملا سجاد حسین بلاشبہ سرسید نہ تھے۔ نہ ان کے حالات وہ تھے جو سرسید کے تھے لیکن محدود وسائل کے باوجود انھوں نے تن تنہا وہ کام کیا جس کی مثال ہمارے ملک میں شاید کم ہی ملے اس لیے وہ عظیم تھے، محترم تھے، قابلِ فخر تھے۔اس

کالج کوانہی کی فکر کی روشنی میں ترقی کے راستے پر بہت آگے بڑھنا چاہیے۔

ملا سجاد حسین نے تعلیم کی دولت کے علاوہ ایک اور قیمتی دولت فخر الدین صاحب کی صورت میں قوم کے حوالے کی۔ جنھوں نے اپنی ساری زندگی کالج کی تعمیر و توسیع اور ترقی میں لگادی وہ ستائش اور صلہ کی پرواہ کیے بغیر مسلسل محنت کرتے رہے اور شہرت و شان و شوکت کو دور سے سلام کرتے رہے اور کالج کی ترقی سے دلچسپی لیتے رہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اپنی نیک دلی کی وجہ سے اساتذہ اور طلبا کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی بلکہ تمام شعبوں کو اپنے طور پر بڑھنے اور کام کرنے کی آزادی فراہم کی جس کی وجہ سے کالج ایک خاص انداز اور رفتار سے ترقی کرتا رہا۔ اگر چہ ذاتی مفاد کے لیے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو بدظنی اور گمراہی پھیلانے کی کوشش کرتے رہے، جھوٹے قصے بھی گڑھے جاتے رہے۔ کبھی کبھی خود مجھے ایسے حالات کا مقابلہ کرنا پڑا اور اس وقت یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ خلوص اور تعلقات کے ساتھ ساتھ محبت، سچائی، ایمانداری، محنت اور مشقت سب ہاتھ جھاڑ کر الگ کھڑی ہوگئی ہیں لیکن یہ بھی سچ ہے کہ فخر الدین صاحب ہر موڑ پر ہمت افزائی کرتے ہوئے محسوس ہوئے اور ہمیشہ محنتوں اور دلچسپیوں کی قدر کرتے رہے۔

ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ جس زمانے میں سیفیہ میں ایم۔اے اردو کی تعلیم شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور پروفیسر سکینہ صاحب کو وکرم یونیورسٹی اجین نے معائنہ کے لیے بھیجا تو کوئی صاحب ان کے پیچھے اس لیے لگے رہے کہ سیفیہ کالج میں ایم اے اردو کھولنے کی اجازت نہ دی جائے کچھ لوگوں نے حد یہ کی کہ فخر الدین صاحب سے کہنے کی ہمت کرلی کہ ایم اے اردو کھولنے سے کالج کو مالی نقصان ہوگا۔ لیکن فخر الدین صاحب ان کی باتوں میں نہ آئے اور ایم اے اردو کھولنے کے فیصلہ پر قائم رہے۔ ان کا یہ قدم ان کی فکری عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

1961 میں جب میں بھوپال آیا تھا اس وقت سیفیہ میں صرف ڈگری تک تعلیم تھی بی اے اردو کے تقریباً پچاس طالب علم تھے لیکن طلبا کی دلچسپی سے یہ تعداد بڑھتی گئی اور شعبۂ اردو ترقی کرتا گیا۔ ایم اے اردو کی تعلیم شروع ہونے کے تین سال بعد پی ایچ ڈی کے لیے تحقیق کا کام شروع ہوا۔ ڈاکٹر مظفر حنفی شعبۂ اردو سیفیہ کالج کے پہلے پی ایچ ڈی ہیں جنھوں نے ایم۔اے میں اول آکر شعبۂ اردو کا نام روشن کیا تھا، آج کل کلکتہ یونیورسٹی میں اقبال پروفیسر کی حیثیت سے کام

کرر ہے ہیں، ایسے ہونہار طالب علم پر کوئی بھی یونیورسٹی فخر کر سکتی ہے۔

بمبئی سے بھوپال آ کر میں نے وہ سارے راستے بند کر لیے تھے جو مجھے باہر لے جا سکتے تھے اور کسی دوسری جگہ کو میرے لیے منزل قرار دے سکتے تھے لیکن جلد ہی احساس ہوا کہ یہاں تحقیقی تنقیدی کام کرنے کے لیے بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ کتابوں کے مطالعہ کے لیے کوئی اچھی لائبریری نظر نہیں آئی۔ اس سلسلے میں تعاون کا ہاتھ بڑھانے والوں کی بھی کمی محسوس ہوئی۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری۔ شعبۂ اردو کے کتب خانہ کی بنیاد اس طرح ڈالی کہ ایک الماری خرید کر اسٹاف روم میں رکھی گئی کچھ کتابیں حاصل کی گئیں کچھ اساتذہ سے کتابیں حاصل کی گئیں۔ کچھ اساتذہ نے کتابیں عطیہ کر کے اپنا تعاون پیش کیا، کچھ ہنسے، مسکرائے اور طنزیہ اشارے کیے، میں دیکھتا رہا ہنستا رہا۔ اپنی راہ پر آگے بڑھتا رہا۔

مجلّہ سیفیہ شائع ہوا تو سارے بھوپال نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، خوشی کا اظہار کیا۔ باہر سے بھی مبارک باد کے خطوط آئے۔ صحت مند تبصرے شائع ہوئے بڑی ہمت افزائی ہوئی حوصلہ بلند ہوا۔

اشتہارات جمع کرا کے نوائے سیفیہ نکالا گیا پہلے شمارے کا خرچ محترمی مخلص بھوپالی مرحوم نے برداشت کیا۔ جو نہایت مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ شعبۂ اردو سے بڑی محبت کرتے تھے۔ نوائے سیفیہ کے تین بھوپال نمبر شائع ہوئے جو بہت پسند کیے گئے لیکن یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔۔

اس دوران میں شعبۂ اردو کا کتب خانہ بنتا گیا باوزن ہوتا گیا کتابیں کس طرح جمع کی گئیں یہ نہ پوچھیے ــــ فقیروں کا بھیس بدل کر تماشائے اہل کرم دیکھتے رہے۔ اس کی طویل داستان ہے بس سمجھ لیجیے ـــــــ شوق نے جنون سے ہاتھ ملا لیا تھا جس نے دیکھتے دیکھتے ایک قیمتی کتب خانہ شعبۂ اردو کے حوالے کر دیا۔ لوگ کہتے رہے اس دیوانگی کا حاصل کیا؟ میں کہتا رہا دیوانگی خود حاصل ہے کہاں سب کو نصیب ہوتی ہے۔

شعبۂ اردو سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو...... اور ہندوستان جاگ اٹھا، علامہ اقبال بھوپال میں، بھوپال اور غالب، قادر نامۂ غالب، شہرتِ غالب، غلب بہ گیتی، غالب با نثر ادنو، نسخۂ بھوپال، اور نسخۂ بھوپال ثانی، انیس نما، نذر سجاد، نذر مخلص، ارمغان سیفیہ، جواہر و آزاد منظر عام پر آئیں اور ادب کے بعض اہم گوشوں کی طرف متوجہ کر گئیں۔ مجلّہ سیفیہ کے غالب نمبر اور

یادگار اقبال نے غالب شناسی اور اقبال شناسی میں مدد کی۔ ادھر سیفیہ کے اردو طلبا کی مجلس ادب، اردوئے معلّٰی اور کاروانِ سیفیہ نے مفید اور اہم ادبی محفلیں منعقد کیں، مشہور شعرا اور ادبا کے ساتھ زندگی کے قیمتی لمحات شعر و ادب کے مطالعے اور ان کی خدمات کے جائزے میں گزارے، محمد یوسف قیصر اور مولانا محوی صدیقی کے ادبی پروگرام، ابراہیم یوسف کے ساتھ ایک شام، کیفی اعظمی کے ساتھ ایک صبح، مجروح سلطانپوری کے ساتھ ایک صبح، اختر سعید خاں کے ساتھ ایک شام، کچھ دیر مرتضیٰ علی شاد کے ساتھ راجندر سنگھ بیدی کے ساتھ ایک نشست، پروفیسر محمد مجیب کے ساتھ غالب صدی پروگرام، فیض احمد فیض کے ساتھ ایک صبح، علی سردار جعفری کے ساتھ کئی ادبی نشستیں، علی جواد زیدی اور جاں نثار اختر کے ساتھ ایک ادبی محفل، اختر الایمان کے ساتھ ادبی گفتگو، تخلص بھوپالی کے ساتھ ایک طنز و مزاح کی شام، علامہ اقبال پر ڈاکٹر عبدالحق کا توسیعی خطبہ، مجلس اردو میں ڈاکٹر گیان چند، آنند نرائن ملاّ کے ساتھ کچھ دیر، مالک رام، سجاد ظہیر، خلیق انجم کے ساتھ شعبۂ اردو میں ادبی نشستیں، ڈاکٹر نارگ کے ساتھ صبح افسانہ، مسیح الزماں، ساگر سرحدی، مجتبیٰ حسین، احسن علی خاں اور اختر جمال کے اعزاز میں جلسے، آفتاب جدید کا ایک سال، آفتاب جدید کے دو سال، سہ ماہی شناخت کا اجرا، عبدالمتین نیاز کے شعری مجموعہ حرف وصدا کی رسم اجرا فنکارانِ سیفیہ کے ساتھ ایک شام، یادگار اقبال کی رسم اجرا، نثر نگاران سیفیہ کے ساتھ ایک شام، خالد محمود کے ساتھ ایک شام، فخر و بھائی کے ساتھ یادگار شام، مظفر حنفی کے ساتھ کچھ دیر شعبۂ اردو میں، قصر سلطانی میں ایک یادگار پروگرام، یاد ابوالکلام آزاد وغیرہ انہی انجمنوں کی کوششوں کا نتیجہ ہیں جو شعبۂ اردو کے کامیاب سفر کی اہم منزلیں ہیں۔

میری طویل زمانہ سیفیہ کالج سے وابستگی میں اٹھارہ سال پرنسپل ڈاکٹر سید اشفاق علی کی آواز گونجتی رہی ایک خاص انداز سے وہ چلتے پھرتے، بات چیت کرتے جلسوں میں تقریر کرتے نظر آئے۔ اپنی چوڑی چمکیلی پیشانی، شگفتہ چہرہ اور مسکراتی آنکھوں کے ساتھ وہ کالج میں مصروف نظر آتے۔ انھوں نے اپنی ذات سے فائدہ کے علاوہ کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ ان کی اسی خوبی کی وجہ سے ان کا زمانہ کالج میں پرسکون رہا۔ وہ کالج کے اساتذہ میں مقبول رہے اور کالج ان کے زمانہ میں ترقی کی پروقار منزل تک پہنچا۔ آج بھی ڈاکٹر سید اشفاق علی کبھی کبھی شدت سے یاد آتے ہیں

خاص طور سے ان کا خلوص یاد آتا ہے۔ ان کی نرم گفتگو یاد آتی ہے۔ ان کی سادگی یاد آتی ہے اور ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

شعبۂ اردو سیفیہ کالج کی یہ کہانی 29 برسوں پر محیط ہے جس میں اس نے اپنا مزاج بنانے اور اپنی پہچان کرنے کی اپنی بساط بھر کوششیں کی ہیں۔ امتحانات میں طلبہ کی نمایاں کامیابیاں، تحقیق کے میدان میں کامرانیاں، مجلّہ سیفیہ کی شہرت نوائے سیفیہ کی مقبولیت، کتابوں کی اشاعت اور ادبی نشستوں کی اہمیت نے شعبہ کو نیک نام کیا، عزیز احمد ایڈوکیٹ، مشتاق سنگھ، جاوید اختر، مظفر حنفی، متین سید، نسیم شہوی، حدیقہ بیگم، صفیہ ودود، محمد ایوب خاں، ارجمند بانو، عمر حیات خاں غوری، آفاق حسین صدیقی، ہارون ایوب، فرحت جہاں، برجیس جہاں، احسن علی خاں، اقبال مسعود ندوی، خالد محمود، محمد نعمان، نثار راہی، کامل بہزادی، اقبال مسعود، خالدہ بلگرامی، منیر الحوی صدیقی، ریحانہ قمر انصاری، انصار انظر، عزیز الغنی ساحر، سیلانی سیوتے، شمیم انور، یعقوب یاور کوئی، سہیل صدیقی، سرفراز دانش، افتخار حسین، وغیرہ بہت سے طلبا اور طالبات نے کالج کے وقار میں نمایاں اضافہ کیا اور شعبۂ اردو کو نیک نام بنایا۔

بلاشبہ یہ کامیابی تنہا میری نہیں ہے، میرے بہت طلبا اور طالبات نے میرا ساتھ دیا۔ جلیل الرحمٰن صدیقی، آفتاب احمد خاں، مقیت اللہ ملک، رشید احمد نقوی، راشد سعید خاں، ساجد علی ندوی سید مظہر علی، اے کے آغا، اعجاز رسول صدیقی، محمد اسحاق ادیب، محبوب الرحمٰن ندوی، عبدالمنان، ماجد حسین صدیقی، بربل ٹبلہ، صلاح الدین، قمر علی شاہ، خورشید اختر، حسام الدین، خلیق صدیقی، محمد نسیم، فیروز بابر، حفظان احمد، بلونت سنگھ، زیب النساصدیقی، انور سلطان، محمود رشید خاں، محمد شفیق خاں، سکندر غالب خالد کمال، ناصر کمال، شمیم بیگم، راحت سلطان، پردین کوثر، نجم الاسلام، حمیرا اقبال، محمود الرحمٰن، شعیب آغا وغیرہ صاحبان کے نام کانوں میں بار بار گونجتے رہے ہیں اور ان کی شعبہ کے لیے بے شمار محبتیں مجھے آج بھی شعبہ کے کام میں مصروف رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے چہرے میرے اردگرد چلتے پھرتے مجھ سے باتیں کرتے شعبہ کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے محسوس ہوتے ہیں جن کے نام طویل زمانے نے میرے ذہن سے محو کر دیے ہیں۔

سیفیہ کالج کے یہ طلبا میرے قدم سے قدم ملا کر دور تک میرے ساتھ چلے ہیں، میرے

معاون رہے ہیں اور کاروانِ اردو کو آگے بڑھانے میں میری توانائی بنے رہے ہیں۔ ان کی وجہ سے میرے حوصلے بلند رہے ہیں اور بلند تر ہوتے گئے ہیں۔ شعبہ ترقی کرتا گیا ہے منزل پر منزلیں مارتا گیا ہے۔ وقت کے ساتھ میری عمر ڈھلتی گئی اور میں آہستہ آہستہ بڑھاپے کی طرف بڑھتا گیا۔ طلبا آتے گئے، جاتے گئے کارواں بنتا گیا۔ سنورتا گیا، پھیلتا گیا اور فخر الدین صاحب اس سفر کی ہر منزل پر سایہ دار، چھتنار درخت بن کر اپنی خوش مزاجی، خوش اخلاقی اور تعاون سے اردو کے کاروان کو تازہ دم کرتے رہے۔ کبھی کبھی کاروان پر سازشوں کی یلغار ہوئی نفرتوں کا سایہ بھی پڑا۔ اور اسے بدنگاہی کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ اس کے اچھے مقاصد کو نقصان پہنچانے کی بھی کوششیں کی گئیں۔ بدظنی اور گمراہی پھیلانے کے کاروبار کو فروغ دیا گیا، تہمت طرازیوں کی مدد سے بدگمانی پھیلانے کی سعی ناکام بھی کی گئی۔ بار بار کردار کشی کے نئے نئے طریقے ایجاد کرنے کی بھی کوششیں ہوئیں جو آج تک جاری ہیں لیکن ایسے تمام گمراہ لوگ اپنی اپنی گمراہی سمیٹے سر کے بل گرے اور یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

سچائی طاقت ہے اور جھوٹ صرف فریب

کارواں ٹھنکتا رہا بڑھتا رہا تو کبھی کبھی ان تنگ دلوں کی تنگ وددو دیکھ کر دل سے آواز آئی۔

تھپیڑے پر تھپیڑے کھا رہی ہے
مگر کشتی سلامت جا رہی ہے

سچی بات تو یہی ہے زندگی کی سلامتی کے ساتھ گزار لینا آج کے مادیت سے بوجھل معاشرے میں آسان نہیں ہے اس معاشرے کی ساری پونجی، حسد، نفرت، احساس کمتری و برتری ناانصافی خودغرضی اور ہٹ دھرمی سے ملا کر تیار ہوئی ہے۔ اس معاشرے میں آپ ایمانداری اور سچائی کی زندگی تنہائی اختیار کر کے بھی نہیں گزار سکتے ہیں آپ کا سماج اسے برداشت نہیں کرے گا۔ وہ آپ کی پرسکون زندگی کو برباد کر کے دم لے گا اور اس توڑ پھوڑ پر فخر کرے گا۔ اگر آپ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں گے تو آپ کی آواز فضا میں لہرا کر گم ہو جائے گی۔ کوئی آپ کی فریاد نہیں سنے گا، آپ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہیں کرے گا، سچائی کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ آپ کے پیچھے آپ کے خلاف اڑائی ہوئی جھوٹی باتوں کو بغیر تحقیق کے سچ مان لے گا۔ بلکہ ظالم کی

آواز سے اپنی آواز ملا کر اپنی دانشمندی پر ناز کرے گا۔ حق اور انصاف کا گلا گھٹنے کا اسے افسوس نہیں ہوگا چاہے اس کی اس ادا سے ایک خاندان کا مستقبل تاریک ہی کیوں نہ ہو جائے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ آج کا سماج بے رحم ہو گیا ہے۔ اسے ذاتی مفاد کے سوا اس بات سے غرض نہیں ہے کہ کون راستہ بہتر ہے اور کون تباہی کی طرف لے جا رہا ہے۔ یہ تباہی خود اس کی ہو سکتی ہے، قوم کی ہو سکتی ہے، ملک کی ہو سکتی ہے، المیہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک کے تعلیمی اداروں میں یہ برائیاں داخل ہو چکی ہیں اور ملک کو نقصان پہنچا رہی ہیں اور کسی کو ہوش نہیں کہ مجرم کی تلاش کرے۔ مرض کا علاج کرے، تعلیمی اداروں کو بچائے اور ملک وقوم کی خدمت کرے۔ ملک کی سچی خدمت یہ ہے کہ تعلیمی ادارہ صرف تعلیمی ادارہ رہے، کالج کے اساتذہ صرف استاد رہیں بس۔

لیکن یہ کہانی اس وقت تک مکمل اور پوری سچائی کی مظہر نہیں بن سکے گی اگر اس حقیقت کا اظہار نہ کیا گیا کہ عمر رفتہ کی تگ ودو میں جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی وجہ میرے گھر کا پرسکون ماحول رہا ہے، جس کا سہرا میری شریک حیات نجم النسا کو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہماری بے غرض اور حرص وہوس سے پاک زندگی ہے جو ہمارے بزرگوں کی تربیت کا نتیجہ ہے اور سب سے اہم میری شفیق اور ٹوٹ کر محبت کرنے والی ماں کی دعائیں ہیں جو قدم قدم پر معاون رہی ہیں جن کے نتیجے میں مجھ میں مصائب کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ اے میری ماں ؎

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

(بحوالہ: 'متاعِ حیات' عبدالقوی دسنوی، ص 1-20)

راجندر سنگھ بیدی

راجندر سنگھ بیدی اپنی اچھی کہانیوں کی وجہ سے بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ شہر شہر، نگر نگر، بستی بستی، قریہ قریہ ان کی افسانہ نگاری کی دھوم ہے ان کی مقبولیت ہی ہے کہ اردو زبان کے علاوہ دوسری زبانوں کے فنکاروں نے ان کی تخلیقات کے ترجمے اپنی زبان میں کیے ہیں تا کہ وہ بیدی کے فن، شخصیت، احساسات، جذبات اور افکار سے آگاہ ہو سکیں اور ان سے فیض اٹھا سکیں۔

اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ عظیم فنکار ہیں، جن پر نہ صرف اردو زبان کو بلکہ سارے ہندوستان کو فخر رہے گا۔ چنانچہ ان کی تصنیف ''ایک چادر میلی سی، پر ساہتیہ اکادمی نے انعام دے کر ان کی عظمتوں کا اعتراف کیا۔لیکن میرے دل میں بیدی صاحب کی عزت اور ان کی شخصیت کا جو احترام پیدا ہوا ہے اس میں ان کی فنکارانہ بلندی کے علاوہ ان کی شخصیت کی معصومیت اور انسان دوستی کو دخل ہے۔آپ ان کو قریب سے دیکھیں گے تو وہ بھولے بھالے انسان کی روپ میں آپ کے سامنے ہوں گے۔ گفتگو کیجیے گا تو آپ محسوس کریں گے کہ کسی ساتھی، کسی دوست سے بے تکلف بات چیت ہو رہی ہے کسی اہم مسئلے پر تبادلہ خیال کیجیے تو جواب اس عاجزی اور انکساری سے دیں گے کہ آپ کو اپنے سروقد کا احساس ہونے لگے گا۔اگر خوش نصیبی سے وہ آپ کے یہاں مہمان کی حیثیت سے آجائیں تو کچھ ہی دیر بعد آپ یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ دراصل آپ مہمان ہیں اور وہ میزبان کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور اگر اس دوران آپ کے میزبانی کا جذبہ جاگ گیا اور آپ نے اپنے فرائض کے تن دہی سے کام لینا چاہا تو وہ اس طرح سے آپ کو میزبانی کے فرائض سے دور رکھیں گے جیسے وہ کہہ رہے ہوں کہ ''آپ بھی حد کرتے ہیں مہمان کا تو فرض ہے کہ وہ اپنے میزبان کی خاطر داری، دلداری آرام اور دل بستگی کا خیال رکھے اس فرض سے مجھے کیوں محروم کر رہے ہیں'' اور اس طرح وہ آپ کو کسی قسم کی خدمت کا موقع نہیں دیں گے۔اب آپ اپنی محبت خلوص اور اس عقیدت کی وجہ سے جو بیدی صاحب سے ہے شرمندہ ہوں، تڑپیں یا پیچ وتاب کھائیں بیدی صاحب اپنی نرم اور دلچسپ گفتگو میں آپ کے اس احساس کو اس طرح ختم کر دیں گے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔میزبان کا تھوڑا بہت تجربہ تو اب ہوا۔ان کے مجسم انسان ہونے کا یقین اس وقت ہوا تھا جب میں سینٹ زیویئرس کالج میں تعلیم پا رہا تھا۔

28/اگست 1957 کو آل احمد سرور صاحب کسی غرض سے ممبئی تشریف لائے تھے اور رائٹرس امپوریم کے ڈائریکٹر عمران مسافر صاحب نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں عصرانہ دیا تھا۔ ممبئی کے ادیب، شاعر اور دیگر معروف ہستیاں اس میں مدعو تھیں۔طلبا بھی شریک ہوئے تھے۔انہی میں میں بھی تھا۔ان عظیم شخصیتوں کے درمیان میری ہستی ہی کیا تھی چنانچہ کچھ

دیر تک ایک گوشہ میں اجنبی بنا کھڑا رہا اور کبھی حالات کا اور کبھی حاضرین کا جائزہ لیتا رہا۔ میں نے دیکھا سب کے تیور الگ، سب کے رنگ جدا اور سب کے مزاج مختلف ہیں کوئی آشنا نظر نہیں آیا لیکن ایک شخص جو بظاہر اجنبی تھا جانا پہچانا لگا، اور وہ تھے راجندر سنگھ بیدی ایک طالب علم کی ایسے موقع پر ہمت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ ڈرا ڈرا سہما و سہما ان کے قریب گیا، بات چیت کی، جو کچھ انھوں نے کہا غور سے سنا اور جو کچھ ان سے سوال کیا اس کا جواب تشفی بخش پایا اور اس کے بعد جب سنٹرل ریلوے اسٹیشن پر سرور صاحب کو رخصت کرنے پہنچا وہاں بھی اجنبی صورت دل آشنا سے ملاقات ہوگئی۔ نہیں نہیں وہاں تو ہم ایسے ملے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اگر چہ اسٹیشن پر بہت سارے لوگ موجود تھے لیکن ایک ادنیٰ طالب علم اپنے وقت کے عظیم فنکار سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہا تھا اور یہ سلسلہ غالباً اس وقت ختم ہوا جب گارڈ نے سیٹی بجائی اور ہری جھنڈی فضا میں بار بار لہرانے لگی اور گاڑی بھی چلنے کے لیے پر تولنے لگی۔ ہم لوگ سرور صاحب کو رخصت کرنے آگے بڑھے۔

اسی زمانہ میں بیدی صاحب سے ایک اور ملاقات ہوئی جس کی یاد اب بھی تر و تازہ ہے۔ بمبئی کے بھولا بھائی میموریل ہال میں انجمن نوجوان مصنفین کے ہفتہ وار جلسے ہوا کرتے تھے۔ ایک اتوار کو بیدی صاحب کی آمد کی خبر گرم تھی۔ چنانچہ ہم لوگ بہت بے چینی سے ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹھیک وقت پر وہ جلسے میں تشریف لائے اور بلا تکلف نئی پود کے درمیان فرش پر بیٹھ گئے کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں پھر اپنی نئی کہانی ''اپنے دکھ مجھے دے دو'' سنانے لگے۔ جیسے جیسے کہانی آگے بڑھ رہی تھی ہم لوگ بیدی صاحب کو اپنے اور زیادہ قریب پا رہے تھے۔ کہانی کب ختم ہوئی پھر کیا کیا باتیں ہوئیں یاد نہیں، البتہ یہ یاد ضرور ہے کہ ہماری آنکھیں پر نم تھیں اور شاید بیدی صاحب کی بھی۔

یہی کچھ ملاقاتیں تھیں جن کی یادوں کو میں نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ اس سال جب مجلس اردو کے افتتاح کا سوال پیدا ہوا تو اس کام کے لیے بیدی صاحب کا نام سرفہرست تھا۔ مجلس اردو کے سکریٹری برادرم کامل بہزادی نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا، مجھے اس وقت اور زیادہ خوشی ہوئی جب فخر الدین صاحب سکریٹری سیفیہ کالج نے بھی اس نام کو سب سے زیادہ پسند کیا۔

موصوف نہ صرف ادب نواز ہیں بلکہ صاف ستھری ادبی نشستوں کے دلدادہ بھی ہیں۔ چنانچہ بیدی صاحب کو خط لکھا گیا جس میں انھیں سیفیہ کالج آنے کی دعوت دی گئی جس کے جواب میں انھوں نے 11رنومبر 1966 کو مجھے تحریر کیا:

''میری کتنی تمنا ہے کہ میں بھوپال پہنچ کر اردو نواز دوستوں سے ملوں لیکن مجھے افسوس ہے میرے حالات اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ اس وقت بمبئی میں ہندستانی بک ٹرسٹ کا پروگرام چل رہا ہے۔ جہاں اردو کے علاوہ پنجابی کا پروگرام بھی میرے ذمے ہے جو 30رنومبر سے پہلے ختم نہ ہوگا۔ حالات کے اس جبر کا میں آپ سے کیا عرض کروں سوائے اس بات کے کہ پھر کسی وقت میں آپ کی قدم بوسی کر سکوں گا''

بیدی صاحب کا یہ جواب اگر چہ انکار میں تھا لیکن ان کے خلوص نے اس خواہش کے لیے تازیانے کا کام کیا۔ آخر یہ طے پایا کہ کامل بہزادی بمبئی ان سے ملیں، چنانچہ وہ بمبئی گئے اور بیدی صاحب کو یہاں آنے پر آمادہ کیا اور اپنی واپسی پر انھوں نے مجھے بیدی صاحب کا خط دیا جس میں تحریر تھا:

''کامل صاحب تشریف لائے ہیں اور میں نے ان کے ساتھ 23ردسمبر 1966 کی تاریخ طے کی ہے امید ہے کہ آپ کو بھی وہ دن منظور ہوگا۔
مجھے افسوس ہے کہ میں نے اس سے پہلے آپ کو قدرے مایوس کیا ہے لیکن بھوپال نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے جتنا میں خود مایوس ہوا ہوں آپ اس کا بھی اندازہ کیجیے۔''

خط پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی اطلاع دی گئی کہ 23ردسمبر کو وہ ضرور تشریف لائیں۔ اگر چہ رمضان کا مہینہ اس کام کے لیے موزوں نہیں معلوم ہوا لیکن بیدی صاحب کے لیے سب کچھ برداشت کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

23ردسمبر کی شام تک ہم لوگوں نے جلسہ کی مکمل تیاری کر لی۔ بیدی صاحب کو ٹھہرانے کا انتظام کیپٹل ہوٹل میں کیا وہ پنجاب میل سے آنے والے تھے۔ یہ گاڑی بھوپال 7 بج کر 5 منٹ پر پہنچتی ہے۔ میں گھر سے 6½ بجے صبح اسٹیشن کے لیے روانہ ہوا۔ راستے میں جلیل صدیقی آملے۔ ہم لوگ گاڑی آنے سے چند منٹ پہلے اسٹیشن پہنچے۔ کامل بہزادی وہاں موجود تھے، گاڑی کے

آنے میں 5 منٹ کی دیر تھی۔ مسافر گھبرائے گھبرائے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے اور گاڑی کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جلد ہی دور سیاہی کی اوٹ سے انجن کی روشنی جھانکی پھر انجن نظر آیا، پلیٹ فارم پر ہنگامہ بپا ہو گیا۔ قلی دوڑ پڑے اور سامان سروں اور ہاتھوں میں اٹھانے لگے۔ اور پھر مسافر اور سامان ادھر سے ادھر ہونے لگے جوں جوں گاڑی قریب آ رہی تھی مسافر اور زیادہ ہراساں نظر آنے لگے۔ گاڑی آئی اور اسٹیشن پر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ہم لوگ پلیٹ فارم کے اگلے حصہ پر تھے۔ فرسٹ کلاس کے پہلے ڈبہ کو دیکھا۔ بیدی صاحب کا کہیں نشان نہ ملا۔ دوسرے تیسرے ہر ڈبے سے مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔ کہاں ہیں بیدی صاحب! اب کیا ہو گا سر چکرانے لگا۔ گھبراہٹ بڑھنے لگی۔ متجسس نگاہیں کبھی پھیلتی تھیں کبھی سمٹ جاتی تھیں کہ اچانک دور پلیٹ فارم پر بیدی صاحب پر نگاہ پڑی۔ وہ گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر ایک صاحب کے ساتھ کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ہم لوگ دوڑ کر قریب پہنچے، مصافحہ کیا باتیں شروع ہوئیں۔ بیدی صاحب کہنے لگے کہ وہ بمبئی میں بیمار پڑ گئے تھے۔ چنانچہ بھوپال آنا مناسب نہ تھا لیکن محض اس خیال سے آ گئے کہ کہیں اسے بہانہ نہ سمجھا جائے۔ ہم لوگ اسٹیشن سے باہر آئے، گاڑی میں سوار ہو کر کیپٹل ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں بیدی صاحب نے دریافت کیا کہ دہلی میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں یہاں سے کون کون حضرات شریک ہو رہے ہیں؟ میں نے کہا اختر سعید صاحب اور شاید کچھ لوگ شرکت کریں گے۔ ہم میں سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ تو غالباً تشریف لے جائیں گے؟ جواب نفی میں دیا۔ میں نے کہا سجاد ظہیر کا خط یہاں اختر سعید خاں صاحب کے پاس آیا۔ جس میں کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں آپ کا نام بھی ہے، کہنے لگے میں بے حد مصروف ہوں کلکتہ جا رہا ہوں اس لیے وہاں پہنچنا ممکن نہیں'' گاڑی بہت تیزی سے سڑک پر پھسلتی ہوئی کیپٹل ہوٹل پہنچ گئی۔

مجلس اردو کا پروگرام صبح میں افتتاح کا تھا اور شام کے وقت افطار کے بعد ہی شام افسانہ کا اہتمام تھا۔ بیدی صاحب نے مجھے خط کے ذریعے اطلاع دی تھی کہ وہ شام ''شام افسانہ'' کے لیے ایک افسانہ پندرہ سترہ منٹ کا ''جنازہ کہاں ہے'' لکھ رہے ہیں لیکن یہاں پہنچ کر انھوں نے بتایا کہ وہ افسانہ آنے سے چند روز پیشتر سردار جعفری اس شرط پر لے گئے کہ دو تین دنوں میں واپس

کردیں گے۔ لیکن آنے سے پہلے انھوں نے واپس نہیں کیا۔ سردار جعفری کی گفتگو آئی تو تعریف کرنے لگے — پھر کہنے لگے کہ معلوم نہیں کیا بات ہے کہ میرا اور سردار جعفری صاحب کا معاملہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ میری پہلی کتاب 'گرہن' اس قدر خراب چھپی کہ میں اسے اپنی کتاب میں شمار بھی نہیں کرتا۔ اس بار افسانے کے سلسلے میں گڑبڑی پیدا ہوگئی۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ افسانہ آپ سے سردار جعفری کیوں لے گئے؟ کہنے لگے کہ وہ ایک پرچہ گفتگو نکال رہے ہیں اسی کے لیے لے گئے ہیں۔ خود ہی مسکرا کر کہنے لگے "میں نے سردار سے کہا کہ" اسے گفتگو کے شروع میں جگہ دیجیے گا آخر میں نہیں"

بات ہی بات میں کہنے لگے کہ سنت فتح سنگھ کا معاملہ کہیں گڑبڑ نہ پیدا کردے۔ ادھر میں سفر میں رہوں گا کسی کے ہاتھ مارا نہ جاؤں۔ پھر مسکراتے ہوئے گفتگو کو جاری رکھا کہنے لگے میں بچپن سے اردو پڑھتا لکھتا رہا ہوں اس لیے پچاس فی صد مزاج مسلمانوں کا ہے اور سگریٹ پیتا ہوں اس لیے پچیس فی صد سکھ بھی نہیں۔ لیکن کون سمجھے گا کہ میں صرف پچیس فی صد سکھ ہوں۔ یہ کہہ کر قہقہہ لگانے لگے۔ دوسرے بھی اس قہقہے میں شریک ہوئے۔

میں آٹھ بجے ان سے رخصت ہو کر کالج آگیا تاکہ یہاں آکر پروگرام کا جائزہ لے لوں۔ البتہ کامل بہزادی صاحب کو تاکید کردی تھی کہ کسی ڈاکٹر کو دکھلاتے ہوئے انھیں 9 بجے تک کالج لائیں۔ یہاں کا کام حیدر عباس رضوی (آنریری لکچرر شعبۂ اردو) اور بلونت سنگھ (صدر مجلس اردو) کے سپرد تھا۔ ان سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سب کچھ درست ہے۔ ٹھیک 9 بج کر 5 منٹ پر بیدی صاحب کالج پہنچے۔ میں انتظار ہی کر رہا تھا انھیں ہمراہ لے کر پرنسپل ڈاکٹر اشفاق علی صاحب کے کمرے میں پہنچا۔ انھوں نے معزز مہمان کو خوش آمدید کہا۔

ٹھیک سوا نو بجے جلسہ شروع ہوا ہال اہل علم اور اہل ذوق حضرات سے بھرا پڑا تھا۔ کامل بہزادی نے مہمان خصوصی کو خوش آمدید کہتے ہوئے شعبۂ اردو کی گزشتہ کارروائیوں پر روشنی ڈالی اور کتب خانہ شعبۂ اردو مجلّہ سیفیہ اور نوائے سیفیہ کا سرسری تعارف بھی کرایا۔

مجھے مہمان خصوصی کے تعارف کا کام دیا گیا تھا میں نے تقریباً دس منٹ تک ان کی انسان دوستی، شرافت اور سادگی پر روشنی ڈالتے ہوئے غالب کے اس شعر پر تعارف کو ختم کیا۔

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

اور پھر اپنے مہمان سے کامل بہزادی نے افتتاحیہ تقریر کی درخواست کی بیدی صاحب مائک پر آئے۔ سب کی آنکھیں چمک اٹھیں اور وہ مجسم گوش بر آواز ہو گئے۔

بیدی صاحب فن افسانہ نگاری پر ایک مضمون لکھ کر لائے تھے بڑے دلچسپ انداز میں پڑھ کر سنانا شروع کیا۔

''ایک محاورہ ہے جتنے منہ اتنی باتیں''

اس لیے مختصر افسانہ کا کوئی کلیہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ دیو مالا اور الف لیلہ کی داستانوں سے لے کر بریٹ ہارٹ اور جونا بارے تک درمیان میں ہزاروں لوگ آئے اور اپنی بات اپنے ہی منفرد طریقہ سے کہتے رہے۔ کسی نے رومان کو اپنا ایمان بنایا اور تحیر کے عنصر کو کہانی کی جان قرار دے کر پڑھنے والوں کو ایسی لذت دی کہ ہوش آگئے یا اڑ گئے! اور چخف جیسے بھی آئے جنھیں زندگی کے ریگستان میں بڑا سا نشر بوزہ مل گیا اور انھوں نے بڑے پیار اور بڑی ہمدردی سے اس کی چھوٹی چھوٹی قاشیں کاٹیں اور سب کے ہاتھوں میں تھما دیں۔ لارنس نے زندگی کی نیم غنودگی میں رنگ و بو کا پھول سونگھا اور ساتھ ہی دوسروں کو بھی سونگھا دیا جو برداشت کر گئے ان کی آنکھیں کھل گئیں اور جو نہ کر سکے وہ آج تک چھینک رہے ہیں۔..................................

سامعین پر ایک عجیب سحر آفریں کیفیت طاری تھی، بیچ بیچ میں تحسین و آفریں کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں اور جب بیدی صاحب نے اپنے مضمون کا آخری حصہ پڑھا۔

''اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ کہانی ایک بنیادی فن ہے جو بڑی محنت اور ریاضت سے ہاتھ آتا ہے اور رفتہ رفتہ آپ کے رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے۔ انسانی اساس کا احساس نہیں جاتا ہے اور جب کہانی کا ترنم آپ کے جسم میں گھل مل جائے تو آپ کو سڑک کے کونوں کھدروں میں کہانیاں پڑی ہوئی ملیں گی۔ آپ کو کہانی تلاش کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے آپ کو آلے گی۔ اس عورت کی مانند جن کا بچہ پیدا کیے بغیر اس دنیا میں زندہ

رہنا بے معنی اور لا حاصل ہے۔"

تالیوں سے سارا ہال گونج اٹھا۔

بیدی صاحب نے افتتاحیہ تقریر ختم کرتے ہوئے کہا کہ "میں اپنے اس مضمون سے اس مجلس اردو کا افتتاح کرتا ہوں"

جلسہ کے ختم ہونے کے بعد بیدی صاحب کتب خانہ شعبۂ اردو میں تشریف لائے۔ شعبۂ اردو سیفیہ کالج کا یہ کتب خانہ 1962 میں قائم کیا گیا ہے اور لوگوں کے تعاون سے اس میں کافی کتابیں جمع ہوگئی ہیں۔ کتب خانہ دیکھ کر بیدی صاحب بہت خوش ہوئے۔ افسانے کے فن سے متعلق یہاں اطمینان سے ان سے گفتگو ہوئی۔ دوسرے اساتذہ بھی گفتگو میں شریک ہوئے۔ مجلّہ سیفیہ، نوائے سیفیہ کی مختلف جلدیں پیش کی گئیں۔ دیکھ کر بے حد حیرت کرنے لگے۔ کہ کالج سے اس قدر بلند معیار کے رسائل شائع ہوتے ہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد چائے کا دور چلا۔ آخر میں تاثرات کے لیے ان سے درخواست کی گئی۔ چنانچہ انھوں نے اپنے تاثرات اس طرح تحریر کیے۔

"یہ کسی نے صحیح طور پر کہا ہے کہ بھوپال آئے بغیر اردو کا ادیب صیقل نہیں ہوتا۔ یہی بات لکھنؤ اور حیدرآباد کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے۔ وہ دو شہر تو میں دیکھ چکا تھا البتہ بھوپال کسی نہ کسی وجہ سے چھوٹ گیا ہے اور میں بہت ممنون ہوں کہ سیفیہ کالج کے پرنسپل جناب اشفاق صاحب اور جناب دسنوی صاحب نے مجھے یہ خوبصورت موقع دیا۔

یہ سیفیہ کالج کے اساتذہ اور طلبا کا کرم ہے کہ انھوں نے مجھ میں ادیب کو فلمی شخصیت پر فوقیت دی۔ یہ ان کے ثقافتی طور پر بلند و بالا ہونے کا ثبوت ہے۔ میں نے ان کی نظروں میں ادب اور ادیب کے لیے عقیدت دیکھی اور اس بات کے لیے میں جناب دسنوی اور کامل صاحب کا ممنون ہوں"

راجندر سنگھ بیدی

23/دسمبر 1966

سوا گیارہ بجے دن کو ہم لوگ شعبۂ اردو سے کیپٹل ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ ہوٹل پہنچ کر

بیدی صاحب سے کچھ ادھر اُدھر کی گفتگو ہوئی پھر بات باقر مہدی صاحب کی شروع ہوگئی کہنے لگے ''لڑتے بہت ہیں، ویسے بہت پڑھے لکھے ہیں۔ مجھے بے حد عزیز ہیں اور پھر ان کی مختلف خوبیوں کا ذکر کرنے لگے۔ بیدی صاحب کی تصانیف کا ذکر ہوا تو انھوں نے اپنی تمام کتابیں جو ہم لوگوں کے دینے کے لیے لائے تھے اٹیچی سے نکالیں۔ پہلے انھوں نے اپنی چار تصانیف 'اپنے دکھ مجھے دے دو'، 'ایک چادر میلی سی'، 'لمبی لڑکی' اور 'سنجوگ' کتب خانہ شعبۂ اردو کو بطور عطیہ دیں۔ مجھے ایک چادر میلی سی، کا نیا ادارہ پاکستان کا اڈیشن دیا۔ جو نہایت خوبصورت گرد پوش کے ساتھ ہے۔ میں نے کہا بیدی صاحب اس ناولٹ پر اس کی تخلیق کا سبب تو تحریر کر دیجیے تو مسکراتے ہوئے لکھنے لگے:

''میں اپنی ماں پنجاب کے تئیں خراجِ عقیدت ادا کرنا چاہتا تھا کوئی کہانی یا ناول میرے خیال میں اتنا کامیاب نہ ہوتا جب مصنف اس میں سوانحی کیفیت نہ لے آئے۔ میں اس ناول کے کرداروں کے ساتھ سویا اور جاگا ہوں۔ اس دھرتی کی بُو کو سونگھا ہے اور ان لوگوں کے دل میں اترنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے من میں ڈوب کر۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی

محمود حبیب کو انھوں نے 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کی ایک جلد عنایت کی اور اس پر تحریر کیا:

''بچھو سے کسی نے گرمیوں میں پوچھا کہ تو سردیوں میں کیوں نہیں باہر آتا ہے تو اس نے کہا کہ گرمیوں میں میری کون سی خاطر ہوتی ہے کہ جاڑے میں باہر آؤں۔''

یہ لکھ کر بیدی صاحب خوب ہنسے اور کہنے لگے ''مجھے یہ کہانی نہ جانے کیوں بہت پسند ہے۔''

محمد احمد رئیس کو بھی 'اپنے دکھ مجھے دے دو' کی ایک جلد دی اور اس پر یہ مصرعہ لکھا ؎

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

نادِ علی کو 'لمبی لڑکی' دیتے ہوئے مجروح سلطان پوری کا یہ شعر تحریر کیا۔

ہٹ کے روئے یار سے تزئین عالم کر گئیں
وہ نگاہیں جن کو اب تک رائیگاں سمجھا تھا میں

''اپنے دکھ مجھے دے دو'' کی تیسری جلد کامل بہزادی کو دیتے ہوئے یہ شعر تحریر کیا۔

ہم ہیں متاع کوچہ و بازار کی طرح
اُٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

اخیر میں جلیل صدیقی نے بیدی صاحب کی دی ہوئی کتاب ''لمبی لڑکی'' ان کی طرف بڑھادی۔ بیدی صاحب بولے کیا لکھوں۔ پھر خود ہی کہنے لگے یہ لکھ دوں۔ ہمیشہ خوش رہو، پھر ہنستے ہوئے اقبال کا یہ شعر لکھ دیا۔

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

کتابوں کی تقسیم کے بعد میں نے دریافت کیا کہ کیا کھائیں گے۔ کہنے لگے بھئی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کچھ کھا تو نہیں سکتا بخشی صاحب آجائیں تو کچھ ابلی ہوئی بغیر مسالے کی چیز لے لوں گا۔ مجھے کالج آنا تھا اس لیے کامل بہزادی اور جلیل صدیقی صاحبان کو وہیں چھوڑ کر چلا آیا۔ یہاں ''شام افسانہ'' کی تیاریوں کا جائزہ لیا۔

تین بجے سے افطار کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اسٹیج کے سامنے بڑی بڑی میزیں جمائی جانے لگیں۔ کالج کے طلبا اور اساتذہ کے علاوہ شہر کے تعلیم یافتہ حضرات اور حکومت کے مختلف شعبوں کے سکریٹری حضرات تشریف لانے والے تھے۔

ٹھیک 3 بج کر پنتالیس منٹ پر نادر علی اور محمود حبیب گاڑی لے کر آئے۔ کالج سے ہم لوگ کیپٹل ہوٹل روانہ ہوئے جہاں سے بیدی صاحب کو ساتھ لے کر گرلس کالج پہنچے۔ یہاں بیدی صاحب نے اپنے ایک مزاحیہ مضمون کے کچھ اقتباسات سنائے۔

چونکہ وقت کم تھا اس لیے زیادہ دیر ہم لوگ گرلس کالج میں نہیں ٹھہر سکے اور معذرت کے ساتھ ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ ہماری گاڑی موتی مسجد سے ہوتی ہوئی بڑے تالاب کے مناظر دامن میں سمیٹتی ہوئی کملا پارک پر نظر ڈالتی ہوئی شملہ کی پہاڑی کی طرف بڑھی۔ گاڑی بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ اور تالاب کا پانی پستی کی طرف سرک رہا تھا اور آخر گاڑی اس پہاڑی کے بلند ترین مقام پر پہنچی۔ نادر علی نے گاڑی روک دی۔ یہاں پستی اور بلندی کا بڑا دلکش منظر تھا۔ پورا

تالاب''سورج کی روشنی کی وجہ سے سیم تن دکھائی دے رہا تھا۔شہر کی عمارتیں دور تک چھوٹی نظر آرہی تھیں۔آفتاب کی سرخی پانی پر اس طرح پھیل گئی تھی جیسے کسی نے اس کے حسین چہرے پر غازہ مل دیا ہو۔

ہم لوگ کچھ دیر تک اس حسین منظر سے کیف حاصل کرتے رہے۔بیدی صاحب اگر چہ بیمار تھے لیکن اس وقت ان کا چہرہ بے حد شگفتہ نظر آرہا تھا۔

گاڑی روانہ ہوئی ہم لوگ ریجنل کالج ہوتے ہوئے نیچے کی طرف اترے چونکہ یہاں سے ڈھلوان شروع ہوتا ہے اس لیے گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی آگے بڑھی اور شالی تانتیا ٹوپے نگر، ٹیگور ہال، حمیدیہ کالج اور نیشنل آرکائیوز وغیرہ کو پیچھے چھوڑتے ہوئے صدر منزل میں داخل ہوئی۔بیدی صاحب کو میں نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ یہ 'شیش محل' ہے جہاں علامہ اقبال نے قیام کیا تھا۔ گاڑی تیزی کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔تھوڑی دیر بعد گاڑی سیفیہ کالج میں آکر رکی۔معزز مہمان کو میں نے اس جگہ لا کر بیٹھایا جہاں افطار کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔بہت سارے حضرات موجود تھے کے بعد دیگر مختلف لوگوں کا تعارف ہوا۔افطار میں چند منٹ باقی تھے۔ہم لوگ میز کے قریب آگئے۔لیجیے توپ چھوٹنے کی آواز آئی سبھی نے افطا شروع کیا۔بیدی صاحب بھی شریک تھے۔اگر چہ بیماری کی وجہ سے بہت کم چیزیں ان کے حصے میں آئیں لیکن ان کی شرکت برابر رہی۔

ساڑھے چھ بجے 'شام افسانہ' کا پروگرام شروع ہوا۔جلسہ کی صدارت پرتاپ کشن ماتھر ڈائریکٹر آل انڈیا، ریڈیو فرمار ہے تھے۔پہلا افسانہ عیسیٰ صدیقی صاحب نے 'دھوئیں کے پہاڑ' سنایا جو پسند کیا گیا۔اس کے بعد بیدی صاحب نے ایک افسانہ اور ایک مضمون 'مہمان' سنایا ان کا انداز اس قدر خوبصورت اور دلچسپ تھا کہ بار بار قہقہوں اور تالیوں سے پورا ہال گونج رہا تھا، بار بار جملوں اور عبارتوں کو مکرر پڑھنے کی درخواست کی گئی۔یہ ایک ایسی ادبی نشست تھی جس میں مشاعرے کا لطف آرہا تھا۔اور اگر چہ لوگوں کی ادبی تشنگی بجھی نہیں اور وہ بار بار مزید کی فرمائش کر رہے تھے۔جلسہ ختم ہونے کا اعلان کیا گیا۔

ہم لوگ بیدی صاحب کو ساتھ لے کر کیپٹل ہوٹل آئے اور وہاں سے ٹھیک نو بجے اسٹیشن کے

لیے روانہ ہو گئے گاڑی اسٹیشن پر لگی ہوئی تھی۔ ادھر بیدی صاحب گاڑی پر سوار ہوئے۔ ادھر گاڑی نے سیٹی بجائی کامل بہزادی نے ٹکٹ بیدی صاحب کے حوالے کیا اور ایک لفافہ میں سفر خرچ پیش کیا۔ بیدی صاحب کچھ متعجب ہو کر پوچھنے لگے یہ کیا، کامل صاحب کے منہ سے صرف اتنا نکلا سفر خرچ۔ بیدی صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی۔ کہنے لگے بھئی کیا تم لوگوں سے سفر خرچ لوں گا؟ کامل بہزادی اصرار کرتے رہے اور وہ مسکراتے ہوئے انکار۔ میں نے کہا بیدی صاحب آپ ہم لوگوں کے ساتھ جس شفقت اور محبت سے پیش آئے ہیں وہی کیا کم ہے کہ مزید یہ کرم، جواب میں سنجیدہ مسکراہٹ تھی میں کچھ دیر کے لیے اس دنیا سے پرے کسی اور دنیا میں پہنچ گیا۔ جہاں محبت، خلوص ہمدردی، انسانیت اور شرافت حکمراں ہوتی ہے۔

ڈبے کو جھٹکا لگا۔ گاڑی آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے سرکنے لگی اور میں پھر اس دنیا میں لوٹ آیا، بیدی صاحب سے ہاتھ ملایا اور بادل نخواستہ چلتی گاڑی سے نیچے اتر آیا اور ڈبے کے ساتھ، دور تک پلیٹ فارم پر دوڑتا چلا گیا۔ مسافروں سے ٹکراتا۔ ٹھوکریں کھاتا، اچانک پلیٹ فارم سے گاڑی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ میں رک گیا میری نگاہیں دور تک گاڑی کا تعاقب کرتی رہیں۔ یہاں تک کہ گاڑی ہندوستان کے عظیم افسانہ نگار کو اپنی آغوش میں چھپائے اوجھل ہو گئی اور میرے لبوں پر یہ شعر مچلنے لگا۔

صحبت اہل صفا نور و حضور و سرور
سرخوش و پرسوز ہے لالہ لب آب جو

(بحوالہ: 'ایک شہر پانچ مشاہیر' عبدالقوی دسنوی، ص: 8-22)

اردو اور نئی نسل
(حقائق کی روشنی میں)

اردو اور نئی نسل سے متعلق 'ہماری زبان' دہلی کے یکم اگست 1999 کا 'اداریہ' اہم ہے۔ اس کو پڑھنے کے بعد البتہ یہ علم نہ ہو سکا کہ 'ہم اردو کیوں پڑھیں' اس سے متعلق لوگوں نے کیا جواب دیا۔ حالانکہ ہر محب وطن اور اردو کو مادری زبان کہنے والا جانتا ہے کہ ہمیں اردو اس لیے پڑھنا چاہیے:

- اردو ہماری مادری زبان ہے۔
- اردو ہمارے محبوب وطن ہندوستان کی خوبصورت شیریں دہن بیٹی ہے۔
- اردو محبت کی زبان ہے۔
- اردو مشترکہ تہذیب کی ترجمان ہے۔
- اردو اتحاد اور دوستی کی نشانی ہے۔
- اردو نے ہمیشہ حب الوطنی کا جذبہ بیدار کیا ہے۔
- اردو نے ہندستان کو آزاد کرانے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔
- اردو سارے ہندستان میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لیے ہندستانیوں کو قریب لانے میں مدد کرتی ہے۔
- اردو کے خزانے میں ہندستان کی تاریخ، تہذیب ادب، مذہب، معاشرہ، سیاست صحافت، داستان آزادی ہند اور معماران ہند کے کارناموں کا بڑا سرمایہ محفوظ ہے۔

اس لیے ہندوستان کی اس قیمتی اور اہم زبان کو جو لوگ مٹانا چاہتے ہیں وہ ملک دشمن ہیں۔ جو محب وطن ہیں وہ اپنے وطن ہندوستان کی ہر چیز سے محبت کرتے ہیں اور اس کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں اور بہانگ دہل کہتے ہیں ع

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اردو مر گئی ہے وہ اردو رسائل نہیں پڑھتے، اردو اخبارات کا مطالعہ نہیں کرتے، اردو کتابیں ان کی نظر سے نہیں گزرتی ہیں۔ اردو سے محبت کرنے والوں سے وہ تعلق نہیں رکھتے، مدرسوں، اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے وہ بے خبر ہیں، وہ یونیورسٹی میں اردو کی تعلیم سے واقفیت نہیں رکھتے۔ ٹی.وی. کے سیریل اور فلموں میں اردو کی سحر کاری کو محسوس نہیں کرتے۔ گویا وہ اردو اور اردو دنیا سے بے تعلق ہیں انھیں نہیں معلوم کہ اردو نہایت شیریں، سہل پُر اثر اور طاقتور زبان ہے، سارے ہندستان میں پسندیدہ اور مقبول ہے۔ بیرون ہند میں بھی اکثر مقامات میں اردو اپنے قدر رداں پیدا کر چکی ہے جن میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

یہ سچ ہے کہ جس وطن کی آزادی کے لیے یہ زبان لڑی اور انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتی

رہی آزادی کے بعد اس کے وطن میں ہماری بیمار سیاست نے نہ صرف اس کی قدر نہیں کی بلکہ اسے اپنے گھروں سے بےگھر کرنے میں مدد کی۔ ثبوت میں یہ کہنا کافی ہے:

(1) آزادی سے پہلے جس طرح لازمی زبان کے ساتھ مادری زبان کے پڑھنے کے لیے آسانیاں فراہم کی گئی تھیں وہ آزادی کے بعد نہیں رہیں۔

(2) آزادی سے پہلے اردو کا استعمال محکمہ ڈاک، محکمہ ریل اور مختلف سرکاری دفتروں میں جس انداز سے ہوا کرتا تھا وہ تقریباً ختم کر دیا گیا ہے۔

(3) اردو اخبارات و رسائل کو عام طور سے شکایت رہی ہے کہ انھیں حکومت اشتہارات اس قدر نہیں دیتی جس قدر دوسری زبانوں کے اخبارات و رسائل کو دیتی ہے۔

یہ چند مثالیں تو 'مشتے نمونہ از خروارے' ہے۔ نہ جانے کن کن گوشوں میں اور کن کن طریقوں سے اپنے وطن ہندستان میں اردو نقصان اٹھا رہی ہے اور اس کا اندازہ ان ہی لوگوں کو ہے جو وطن کے فدائی اور اردو کے شیدائی ہیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں مرحوم سے لے کر آج تک آزاد ہندستان میں مختلف اشخاص اور مختلف اداروں، خاص طور سے انجمن ترقی اردو (ہند) نے اردو کو اس کے حقوق سے محروم ہونے سے بچانے کے لیے مختلف انداز سے کوششیں کیں جن کے جواب میں دل لبھانے والی تقریریں سنی گئیں، طرح طرح کے وعدے کیے گئے، کچھ ہمدردانہ جملے فضا میں گونجے، کچھ کمیٹیاں وجود میں آئیں پھر اس کے بعد وہی خاموشی اور سرد مہری۔

بلاشبہ کبھی کبھی از راہ کرم کچھ ادارے قائم کیے گئے ان میں ایوان غالب، ترقی اردو بیورو، اردو یونیورسٹی وغیرہ اور صوبوں میں اکادمیوں کے قیام قابلِ ذکر ہیں۔ بےشک یہ اردو کے لیے کچھ مفید کام ہوئے ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ ان سے اردو کو فائدہ کم پہنچ رہا ہے، اشخاص کو زیادہ اور وہ بھی ایسے اشخاص کو جو اردو سے کم سیاست سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں جس کے نتیجے میں عام طور سے اخبارات و رسائل میں خاص طور سے اکادمیوں سے متعلق اس قسم کی شکایتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔

(1) انعامات کی تقسیم میں ناانصافی کی جا رہی ہے۔

(2) سیمیناروں اور مشاعروں میں دوست نوازی اور اقرباپروری کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔

(3) کتابوں کی اشاعت میں خودغرضیاں سامنے آرہی ہیں۔

(4) غیر متعلق حضرات اکادمیوں میں داخل کیے جارہے ہیں اس طرح کی اور بھی بہت سی شکایتیں سننے میں آتی رہتی ہیں۔

اردو عوام کی یہ شکایتیں کہاں تک بجا ہیں، اس کا صحیح اندازہ تو اس وقت ہوگا جب اردو عوام یا حکومت منتخبہ کمیٹی یا کمیٹیوں کے ذریعے تحقیقات کرائے۔ اس کے ساتھ یہ کوشش کی جائے کہ یہ ادارے اور یہ اکادمیاں لائق اور مستحق لوگوں کے ہاتھوں میں رہیں۔ میری مراد ایسے لوگوں سے ہے جو اردو سے سچی محبت کرتے ہیں جن کی عمر کا طویل حصہ اردو زبان وادب کی خدمت میں گزرا ہو اور جن کے گھروں میں اردو عزت کے ساتھ جی رہی ہو۔

آزادی کے بعد ایک حادثہ یہ بھی ہوا ہے کہ ایک جماعت ایسی ابھر کر آئی ہے جو اردو کے ذریعے روزی روٹی اور شہرت، انعام و اکرام تو حاصل کرتی رہتی ہے لیکن وہ اردو کی وفادار نہیں ہے۔ اس جماعت میں اردو کے اساتذہ بھی ہیں۔ شعرا اور نثر نگار بھی ہیں ادبی انجمنوں سے متعلق بھی اور سیاسی مفاد پرست بھی ہیں۔ یہ اداروں میں تعلیم گاہوں میں داخل ہو کر یا باہر رہ کر اداروں کے وقار کو اور اردو کے مفاد کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان میں کوئی چاہتا ہے کہ سارے بڑے انعامات انہی کے حصے میں آجائیں، کوئی چاہتا ہے کہ ہر ادبی محفل میں (بغیر کسی خوبی کے) سب سے نمایاں رہے، کوئی چاہتا ہے کہ ہر سیمینار میں وہ شریک ہو، چاہے زبانی مقالہ پیش کرے۔ کوئی چاہتا ہے کہ مشاعرے میں وہ بلایا جائے چاہے پرانی غزل ہی سنائے، کوئی چاہتا ہے کہ قومی اداروں سے کسی کی کتاب شائع ہو یا نہ ہو اس کی کتاب ضرور شائع ہو چاہے دوسروں کے مضامین کا مجموعہ ہو۔

ان حالات میں اردو کے خاموش خدمت گزاروں، خوددار فنکاروں، عام طبقہ سے ابھرتے ہوئے نوجوان ادیبوں کو جن سے اردو اپنے گھروں میں عزت آبرو کے ساتھ جی رہی ہے کون پوچھتا ہے۔ شاباش! ایسے لوگ جو نہایت خاموشی کے ساتھ ان ناانصافیوں کو برداشت کر رہے ہیں اور اردو کی خدمت اپنے بچوں کو اردو تعلیم دلا کر اور دوسرے مختلف طریقوں سے کر رہے ہیں۔ قابل تعریف ہیں وہ لوگ جو نامساعد حالات کے باوجود مدرسوں اور اسکولوں کے ذریعے نئی نسل کو

اردو کی تعلیم دلا رہے ہیں اور ان کے دلوں میں اردو کے لیے محبت پیدا کر رہے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے دم سے آج مدرسوں میں، اسکولوں میں، کالجوں میں اور یونیورسٹیوں میں اردو زندہ اور بعض علاقوں میں بہت صحت مند اور توانا ہے۔ ایسے ہی اردو کے عاشقوں کی وجہ سے آج بھی یہ مصرعہ فضا میں گونجتا محسوس ہوتا ہے ع

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

اردو سے محبت کرنے والے حضرات اگر یہ کہیں کہ اردو گھروں سے بے گھر ہو رہی ہے تو اسے غلط انداز سے نہیں پیش کیا جائے اس لیے کہ اگر آج آپ جائزہ لیں تو اردو کے ایسے بہت سے گھر نظر آئیں گے جہاں اردو برائے نام ہے یا نہیں ہے یعنی،

(1) ان کے بچے اردو نہیں پڑھتے۔

(2) ان کے یہاں اردو میں خط و کتابت نہیں ہوتی۔

(3) ان کے یہاں تقریبات کے دعوت نامے اردو میں نہیں چھپتے۔

(4) ان کے یہاں اردو اخبارات اور رسائل خریدے نہیں جاتے۔

(5) ان کے یہاں اردو کتابوں کی خریداری کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی وغیرہ۔

ایسے لوگ دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جو اردو سے بے تعلق ہو کر اپنی زندگی گزار رہے ہیں اور دنیاوی ضرورتوں کے لحاظ سے اپنے بچوں کو تعلیم دلا رہے ہیں۔ دوسرا حصہ وہ ہے جو عملاً اردو سے دلچسپی نہ رکھتے ہوئے اردو سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ لوگ کبھی جوڑ توڑ سے انعامات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کبھی تعلقات سے فائدہ اٹھا کر بار بار سیمیناروں یا مشاعروں میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ کبھی اپنے ذرائع سے اداروں کو اپنی کتابیں شائع کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اپنے فائدے کے لیے اردو کے مخلصین کے خلاف سازش کرتے نظر آتے ہیں اور جھوٹے الزامات لگاتے رہتے ہیں، اپنی نادانی سے سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح اپنے قد کو بڑا کر رہے ہیں۔

اردو کے سچے خدمت گزاروں کو جہاں اردو کے دشمنوں سے اردو کے لیے خطرہ محسوس ہوتا ہے وہیں مفاد پرستی کے اس طبقہ سے بھی ڈر لگا رہتا ہے۔ کیونکہ ایسے ہی لوگوں نے اکثر اہل اردو

میں مایوسی کی فضا پیدا کرر کھی ہے جس کی وجہ سے عوام اردو سے دور ہوتے جارہے ہیں اس لیے اگر کسی جلسے میں یا کسی تحریر میں اردو کے حال زار کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کا مقصد یہی ہے کہ مخلصین اہل اردو کو اردو کی تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں تا کہ اردو کو کسی طرح کا نقصان نہ پہنچے۔

نئی نسل کے وہ افراد جو اردو سے ناواقف ہیں اور اپنی مادری زبان کی اہمیت اور قدر و قیمت نہیں سمجھتے ،اس میں ان کا قصور نہیں ہے، قصور ان کے والدین کا ہے جنھوں نے اپنے بچوں سے ان کی مادری زبان چھین لی ہے۔ وہ نہیں جانتے ہیں کہ مادری زبان کی کیا اہمیت ہے اور بچوں کی ذہنی تعمیر میں مادری زبان کیا کردار ادا کرتی ہے۔

ابھی تو اردو کے کچھ گھروں میں ہی نئی نسل اردو سے بے تعلق ہوتی جارہی ہے اگر ہم اس طرف متوجہ نہ ہوں گے تو آنے والی نسل میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جائے گی جو اردو سے نا آشنا ہیں گے اور ہماری بے توجہی سے ان میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

اس لیے مخلصین اردو کو فکر مند ہونا چاہیے اور اہل اردو کو مادری زبان کی اہمیت اور ضرورت سے آگاہ کرنا چاہیے۔ انھیں یہ بتانا چاہیے کہ ہم ضرورت کی ہر زبان سیکھیں لیکن کسی قیمت پر مادری زبان اردو کو نظر انداز نہ کریں، ساتھ ہی ساتھ ہم ایسی تعلیم گاہیں قائم کریں جہاں دوسری زبانوں اور مضامین کے ساتھ مادری زبان اردو کی تعلیم باضابطہ دی جائے۔ اسی کے ساتھ اردو رسائل اور اخبارات کے مطالعے کا شوق پیدا کرنے کے لیے دارالمطالعے اور کتب خانے قائم کیے جائیں۔ ایسی انجمنیں بھی قائم کی جائیں جو اردو کی خدمت کے لیے وقف ہوں۔ جو مختلف انداز سے اردو عوام میں اردو سے دلچسپی پیدا کریں اور اس کی خدمت کے لیے ان میں سچا جذبہ بیدار کریں تا کہ اہل اردو اپنی روزانہ نجی اور سماجی زندگی میں اردو کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ اسکولوں اور کالجوں کے اردو اساتذہ کو چاہیے کہ اردو تعلیم کو فروغ دینے کے لیے طلبا میں اردو سے خاص دلچسپی پیدا کریں تا کہ وہ اردو اخبارات، رسائل اور کتابیں پڑھنے میں دلچسپی لیں۔ اساتذہ یہ کوشش بھی کریں کہ اردو کو فروغ دینے کا جذبہ عوام میں زیادہ سے زیادہ پیدا ہو تا کہ اسکولوں اور کالجوں میں اردو طلبا کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہوتی جائے اس طرح زیادہ سے زیادہ اساتذہ کے تقرر کی راہ بھی نکلے گی۔

آج ہندستان میں اردو کے ذریعے اہل اردو کی کثیر تعداد روزی حاصل کر رہی ہے اور عزت کی زندگی بھی گزار رہی ہے، اگر یہ اساتذہ اپنی ذمے داریوں کو نہیں سمجھیں گے اور طلبا کم ہوتے جائیں گے تو اردو کی جگہیں خدانخواستہ ختم ہوتی جائیں گی اور بے شمار لوگ بے روزگار ہو جائیں گے۔

اس سلسلے میں اردو اخبارات کے بھی اہم فرائض ہیں۔ بلاشبہ بعض رسائل اور اخبارات اردو کے فروغ کے لیے نہایت دلچسپی کے ساتھ کوششیں کر رہے ہیں لیکن وقت آگیا ہے کہ ہر میدان میں اردو کی ترقی کے لیے اہل اردو کو فکر مند ہونا چاہیے۔ اردو انجمنوں کو بھی اس طرف متوجہ ہونا چاہیے اور اردو کو زیادہ سے زیادہ وسیع حلقوں میں پھیلانے اور اس کو جائز حق دلانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اردو کو اردو دشمنوں اور مفاد پرستوں سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیے دشمن تو کھل کر سامنے آتا ہے مفاد پرست حضرات اردو دوست بن کر سامنے آتے ہیں اور اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے لیے اردو کو اور اردو دوستوں کو کاری زخم لگاتے ہیں۔

یہ بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ اگر ہم متحد اور متفق ہو کر اردو کے فروغ کے لیے کوشش کریں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ اردو ترقی کی بلند ترین منزل تک نہ پہنچے گی اور اس صورت میں اردو کو اس کے جائز حق سے محروم کرنے کی ہمت کسی کو نہیں ہوگی پھر کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ نئی نسل اردو سے ناآشنا ہوتی جا رہی ہے بلکہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں نئی نسل اردو کے چھتنار درخت کے سائے میں پروان چڑھتی اور ترقی کرتی نظر آئے گی۔

(بحوالہ: 'میں اردو ہوں' عبدالقوی دسنوی، ص: 77 تا 83)

شاید کہ ترے دل میں اتر جائے مری بات

ہم ہندستانیوں کو اپنے ملک پر، اس کے رہنے والوں پر، اس کی مختلف زبانوں پر اس کے قدرتی حسن اور خوبصورت مناظر پر اس کے دریاؤں اور پہاڑوں پر اس کے میدانوں اور سبزہ زاروں پر اس کے چرندوں اور پرندوں پر ہمیشہ سے فخر و ناز رہا ہے۔ شمال میں طویل و عریض اور بلند و بالا ہمالہ نے اپنے دامن کو ایک ماں کی آغوش کی طرح اس ملک کے لیے پھیلا رکھا ہے اور اس کے لیے امن و سکون کا باعث بنا ہوا ہے اور صدیوں سے اس کی پاسبانی کر رہا ہے یہ وہی ہمالیہ ہے

جس کے بارے میں شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے اپنے پہلے شعری مجموعہ 'بانگ درا' کی پہلی نظم 'ہمالہ' میں کہا ہے۔

اے ہمالہ اے فصیلِ کشورِ ہندوستاں
چومتا ہے تیری پیشانی کو جھک کر آسماں
تجھ میں کچھ پیدا نہیں دیرینہ روزی کے نشاں
تو جواں ہے گردشِ شام و سحر کے درمیاں
ایک جلوہ تھا کلیم طورِ سینا کے لیے
تو تجلی ہے سراپا چشمِ بینا کے لیے

اور جنوب میں لامحدود پھیلا ہوا، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، اپنی بے پناہ وسعتوں اور بے اندازہ قوتوں کے ساتھ اس ملک کی دربانی اور رکھوالی کر رہا ہے اور دنیا کے مختلف دور دراز ملکوں، عظیم شہروں، نئی پرانی تہذیبوں، مختلف مذاہب کے ماننے والوں، طرح طرح کی رسموں اور رواجوں کے پابند لوگوں اور ان کے مختلف زبانوں سے ہندوستان اور اس کے بسنے والوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور ایک دوسرے کو متاثر کرنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ دنیا کے مختلف خطہ کے رہنے والے کبھی سیاحت، کبھی تجارت، کبھی صنعت وحرفت کے بہانے ہندوستان آتے رہے ہیں اور اپنے اپنے ملکوں کو فیض پہنچاتے رہے ہیں اور اپنی اپنی تہذیب زبان وادب سے اس ملک کو مالا مال کرتے رہے ہیں۔ خود اہلِ ہند بھی دنیا کے مختلف ملکوں میں، سمندروں، پہاڑوں اور جنگلوں کے سینہ کو چیر کر پہنچتے رہے اور یہاں کی خوبیوں اور خصوصیتوں کو برآمد اور وہاں کی اچھائیوں اور زندگی بخش علوم کو درآمد کرتے رہے ہیں۔

اس ملک کے شمال مغربی دروازے بھی صدیوں سے غیر ملکیوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں جن سے ہو کر مختلف قومیں کارواں در کارواں اپنی مختلف تہذیبوں اور زبانوں کے ساتھ اس ملک میں داخل ہوتی رہی ہیں اور اس کے ٹھنڈے اور میٹھے پانی سے سیراب اور فرحت بخش، پُر کیف ہواؤں سے تازگی، اس کے کوہستانوں اور سبزہ زاروں سے کیف ومستی اور اس کی زبانوں اور تہذیبی رنگا رنگیوں سے فیض یاب ہوتی رہی ہیں اور اس کے پُرسکون اور پُرخلوص ماحول کی

قدر داں بنتی گئیں ہیں۔ ہر دور میں اس ملک کے امن و آشتی اور سکون و سلامتی نے انھیں خوش آمدید کہا ہے اور ان کے قدم چومتے ہوئے ایک خاص لذت محسوس کی ہے۔ قوموں کی آمد و رفت اور تہذیبوں کے میل جول کا سلسلہ یہاں مدتوں سے قائم ہے۔ یہ ملک ہمیشہ امن و آشتی کا گہوارہ بنا رہا ہے اور ہر زمانے میں مختلف قومیں، تہذیبیں، زبانیں یہاں کی پرسکون فضا اور پرخلوص ماحول میں پرورش پاتی رہیں اور پروان چڑھتی رہی ہیں اور اس طرح ہمارا وطن ہندستان رنگا رنگ تہذیب و معاشرت، زبان اور بولی اور رنگ و نسل کے انسانوں سے مل کر ایک حسین گلدستہ کی صورت اختیار کرتا رہا ہے اور دنیا کے لیے جنت بہ داماں ثابت ہوتا رہا ہے۔

متحدہ ہندوستان کی عظمت اس کی رنگا رنگ تہذیبوں سے تھی اور آج بھی ہے اس کی بڑائی اس کے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے آپسی میل جول میں ہے، اس کی قدر و منزلت اس کی مختلف زبانوں کے بولنے والوں کے اتحاد و اتفاق میں ہے۔ صدیوں کے تاریخی، سیاسی اور تہذیبی سفر کے نتیجے میں اس برصغیر کے باشندوں کے درمیان نہ مذہبی تعصبات، دوری، پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے نہ زبانیں ایک دوسرے کے درمیان محبت اور تعلق کو کاٹ چھانٹ سکیں، نہ سیاست کا جادو دلوں کو توڑنے میں ہمیشہ کے لیے کامیاب ہوسکا۔ اگر جائزہ لیا جائے تو صاف محسوس ہوگا کہ جس طرح مختلف تہذیبوں نے مل کر مشترکہ تہذیب پیدا کرنے میں مدد کی ہے اور مختلف زبانوں کے مختلف لفظوں اور آوازوں نے مل کر ایک عام فہم زبان (اردو) بنانے میں تعاون کیا ہے اسی طرح مختلف رنگ و نسل اور مذہب و ملت کے لوگ ایک دوسرے سے مل کر، رسم و راہ قائم کرکے، رشتوں ناتوں میں منسلک ہوکر، ایک جیسے بن گئے اور ہندستانی کہلائے۔

اسی مشترکہ تہذیب اور زبان نے مختلف مذاہب اور بھانت بھانت کی زبانوں کے باوجود سارے ہندستانیوں کو ایک لڑی میں پروئے رکھا ہے جس نے ہمیں مضبوط مستحکم اور سربلند قوم بنا دیا ہے۔ جس کی طاقت نے انگریزوں کے ہندوستان کو مسلسل غلام بنائے رکھنے کے عزم کو چکنا چور کردیا، چنانچہ انھیں ہندوستان چھوڑ کر جانا پڑا۔ لیکن جاتے جاتے انھوں نے ہندستانیوں کے دلوں میں تقسیم کا خنجر بھونک دیا۔ یہ کام ان کا کوئی نیا نہیں تھا۔ انھوں نے ہندستانیوں کے درمیان

مذہبی منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی اور لسانی تعصبات میں مبتلا کرنے کی سازش کرتے رہے جن کے نتائج آج تک ہم بھگت رہے ہیں۔

اس لیے ہمیں ماضی سے سبق لینا چاہیے اور متحد و متفق ہو کر رہنا چاہیے۔ منافرت کو محبت میں بدل دینا چاہیے دوری کو قربت میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ ایک دوسرے کا معاون و مددگار بننا چاہیے اور ملک کی ترقی میں لگ جانا چاہیے تاکہ ہمارا ملک ایک عظیم تر ہندوستان بن کر ابھرے اور دنیا کی رہنمائی کرے۔

اس طرح ہم علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر پیش کر سکیں گے جنھیں اس سرزمین میں امید کی کرن دکھائی دی تھی جس کا اظہار انھوں نے اپنی نظم ''شعاعِ امید'' میں اس طرح کیا ہے۔

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پُرآشوب ہے پایاب

(بحوالہ: میں اردو ہوں، عبدالقوی دسنوی، ص:94-96)

....

کتابیات

(1) علامہ اقبال بھوپال میں، عبدالقوی دسنوی، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1967

(2) بھوپال اور غالب، عبدالقوی دسنوی، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال 1969

(3) غالبیات، عبدالقوی دسنوی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ، 1970

(4) ایک شہر پانچ مشاہیر، عبدالقوی دسنوی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1973

(5) اقبال اور دلّی، نئی آواز، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1978

(6) متاعِ حیات 1980

(7) اقبالیات کی تلاش، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1984

(8) یادگار سلیمان، بہار اردو اکادمی، کلکتہ 1984

(9) اردو شاعری کی گیارہ آوازیں، نئی آواز، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی 1993

(10) حیاتِ ابوالکلام آزاد، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 2000

(11) عبدالقوی دسنوی ایک مطالعہ، مرتبہ محمد نعمان خاں، کوثر صدیقی، 2001

(12) بمبئی سے بھوپال تک، عبدالقوی دسنوی، 2004

(13) میں اُردو ہوں، عبدالقوی دسنوی، 2006

(14) سرمایۂ ادب، محمد نعمان خاں، 2008

(15) عبدالقوی دسنوی - حیات اور خدمات،
مرتبہ محمد نعمان خاں، کوثر صدا آفاق حسین صدیقی، 2013

آزدای کے بعد جن محققین اور ناقدین نے اردو تحقیق وتنقید کی روایت کوتوانا اور ثروت مند بنایا ان میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی بھی شامل ہیں۔ انھوں نے غالب، اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کو موضوع بنایا اور ان اکابرین ادب کی شخصیت اور علمی خدمات کا جائزہ لیا۔ انھوں نے اردو میں اشاریہ سازی کی روایت کو بھی فروغ دیا۔ انھوں نے اپنے علمی کاموں کے ذریعے کئی نسلوں کی تربیت میں حصہ لیا۔ وہ ایک اچھے ادیب اور ذمہ دار استاد بھی تھے۔ ان کی کتابوں میں حیات ابوالکلام آزاد، ابوالکلام آزاد، اجنبی شہر، اردو شاعری کی گیارہ آوازیں، اقبال اور دلّی، اقبالیات کی تلاش، بھوپال اور غالب، پریم چند، تلاش آزاد، حسرت کی سیاسی زندگی چند جھلکیاں، سات تحریریں، ایک شہر پانچ مشاہیر اور نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی وغیرہ خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان پر یہ مونوگراف دیوان حنان خاں نے تیار کیا ہے۔ جو این سی ای آر ٹی، نئی دہلی سے وابستہ ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025

ISBN 978-81-934243-0-8
ISBN 819342430-1
NCPUL
New Delhi
₹ 70.00